Scanned by CamScanner

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

دنیا کا مقامی اردو رسالہ

ISSN : 0971 - 6009

جلد:27 | جنوری-فروری 2012ء | شمارہ : 1-2

مدیر : ف۔س۔اعجاز

اس شمارے کی قیمت : -/25 روپے

زرسالانہ نقد/منی آرڈر

یا بینک ڈرافٹ سے : -/150 روپے

بیرون کلکتہ چیک کلیئرنگ چارج 60 روپے زائد

مغربی ممالک سے : 15 £
or
US $ 25

پاکستان، بنگلہ دیش میں سالانہ : -/IR 400

سال میں ۶ شمارے شائع ہوتے ھیں۔

INSTRUCTIONS FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف INSHA PUBLICATIONS کے نام میں روانہ فرمائیں۔ بیرون ملک سے WESTERN UNION کے ذریعہ "F.S.Ejaz" کے نام میں رقم ٹرانسفر کی جاسکتی ہے۔ اور یہی قابل ترجیح ہے۔

گرافک آرٹ،
سرورق،
تزئین وتکمیل:
ثاقب فیروز

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط وکتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
25-B, Zakaria Street, Kolkata - 700073
Fax : +9133-40075435 • Phone : +9133-22354616 • Mobile : +919830483810
E-mail : inshapublications@yahoo.co.in • E-mail : insha.publications.kolkata@gmail.com

لال قلعہ میں اردو وراثت میلہ

ایک زبان جس کا قومی یک جہتی کی زندہ مثال ہونا ہندوستان کی لسانی تاریخ سے ثابت ہے، جس کی شکل مغل لشکر اور ہندوستانیوں کے میل جول اور آپسی بول چال سے تیار ہوئی، جس کے نکھرے ہوئے روپ کو گنگا جمنی تہذیب کا موثر وسیلہ اظہار قرار دے کر اردو کے نام سے معروف و منظم کرلیا گیا اسے تقسیم ملک نے شدید صدمات پہنچائے۔ اس کا چہرہ مسخ ہوا اور اب تک وہ اپنے مولد و مسکن میں بھی اپنی ثقافتی شناخت کی بحالی کے لئے سرکاری سرپرستی کی متلاشی ہے۔ اردو ہندوستان میں جہاں کہیں بھی جمعیتی حیثیت میں ہے صرف ایک زبان نہیں ایک خودکار تہذیبی اکائی ہے۔ لسانی سیاست کھیلنے والی اتحاد شکن قوتیں آج بھی اس مشترکہ تہذیب کی طاقت کے آگے سر جھکا دیتی ہیں جو فی الحقیقت اردو کی پروردہ ہے۔ لہٰذا صدیوں کے اس تہذیبی ورثہ کی حفاظت بیحد ضروری ہے جس سے ہم ہم ہیں، ہماری شناخت قائم ہے۔

قابلِ غور ہے کہ اردو وہ زبان ہے جو کل وطنی یگانگت و اخوت کی پہچان ہے۔ دیگر ہر زبان جُزو وطنی یا زیادہ صحیح طور پر کہا جائے تو علاقائیت کا شناخت نامہ بن کر سامنے آتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جدید قومی منظر نامے میں ہر علاقائی زبان کا تشخص اس کے کلچر سے مضبوطی سے جُڑا ہوا ہے چاہے اس سے صوبائی انا اور تعصب کو تقویت حاصل ہوتی ہو۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی زبان، چھوٹے سے چھوٹا کمیونٹی کلچر ملک کی اندرونی سیاست اور جغرافیہ کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ لیکن اردو ایک زیادہ بڑے، زیادہ روادار مشترکہ کلچر کی پشت پناہی کے باوجود کسی یقینی تحفظ سے محروم ہے۔ ان دنوں غیر اردو صوبائی اکیڈمیاں اپنی زبانوں کے ساتھ ضمنی طور پر اپنی مقامی ثقافت کو بھی بتدریج فروغ دینے لگی ہیں۔ ان کا ادب ان کے ثقافتی ہنگاموں میں بھی شریک ہو لیتا ہے۔ اس طرح غیر اردو صوبائی اکیڈمیوں کو ادب کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری، ڈرامہ وغیرہ سے معاونت و مراسمت میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اردو اکیڈمیوں نے اپنا دائرۂ کار محدود کر رکھا ہے۔ اس سے ادب کی بین الفنون عمل آوری کی گنجائش نہیں نکل پاتی۔ جبکہ ثقافت بھی معاشرتی علوم و فنون کا آمیزہ ہے۔ اور جدید سوسائٹی میں مختلف فنون باہمی اشتراک اور انحصار کی بنا پر فروغ پا رہے ہیں۔ صحافت کو دیکھئے جواب میوزک، مصوری، تھیٹر، فلم سازی سے بھی مربوط ہو چکی ہے۔ جہاں ایسا ہے وہاں ادب اور فن دونوں کے تموّل میں اضافہ ہو رہا ہے اور فرد کا تہذیبی شعور ترقی کر رہا ہے۔ اپنے تہذیبی ورثہ سے لاتعلق رہ کر ہمارا دائرہ کار مختصر رہ جائے گا۔ زبان کے قومی سیاست پر اثر انداز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ثقافت کو فراموش نہ کرے بلکہ اُس کی محافظ بھی بنے۔ صرف مشاعرے کو ثقافتی سروکار کا علامیہ سمجھنا یقیناً غلط ہوگا۔ اور سیمیناروں سے بھلے ہی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ ملتا ہو تہذیب کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ نقاد بیشک ادب کی صورت گری کا فریضہ انجام دیتے ہیں لیکن وہ محض کتاب، مائک اور ڈائس کے آدمی ہو کر ادب کو عہدِ رواں کے مقاصد سے آشنا کرپائیں یہ ضروری نہیں۔

ہمارے درمیان بعض نقاد تہذیب سے ادب کے عملی سروکاروں کو بھی روشن کرتے ہیں۔ لیکن کم کم۔ البتہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک دانا و بینا نقاد گوپی چند نارنگ نے اپنے باقاعدہ لسانی، اسلوبیاتی مطالعات سے معاشرے کا اندرونی ایکسرے کر کے تہذیب کے نہاں خانوں کا ایک بھرپور جائزہ پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی پچھلی چند تصنیفات کے علاوہ حالیہ کتاب ''کاغذِ آتش زدہ'' کے بعض مضامین میں زبان کی گدڑی سے کلچر کے لعل برآمد کر کے نہ صرف ہمیں حیران کیا بلکہ اہلِ اردو کی ثقافتی حسیات کو بھی تیز کر دیا ہر چند کہ ایک نقاد کے طور پر یہ رول ادا کرنا ان کا منشا نہ تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان کی چادر اوڑھ کر سوئی ہوئی ثقافت کو نارنگ صاحب نے اپنی تحریروں سے جگایا ہے۔ مقصد یہ کہ زبان کا بختِ خفتہ جاگی ہوئی تہذیب ہی جگا سکتی ہے اور غنودہ ادب کو نیند سے اٹھا کر کام سے لگانے والے نقاد ہماری پہلی ضرورت ہیں۔ اس سے یہ نکتہ برآمد ہوتا ہے کہ ثقافت کے محاذ پر متحرک رہ کر ہم سوسائٹی میں اپنے لئے خاصی گنجائش پیدا کر سکتے ہیں اور حکومت سے اپنے جائز مطالبات بھی منوا سکتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعہ زبان سے منسوب تنگ ذہنی یا علیحدگی پسندی کا غلط الزام بھی کٹے گا اور یہ عمل ہماری ثقافتی وراثت کا محافظ بھی ثابت ہوگا۔

اردو اکیڈمیاں اردو کے ثقافتی ورثہ سے لاتعلق رہ کر خود کو محض اردو زبان کی ''ادارہ جاتی'' خدمت کے روٹین کی پابند کر چکی ہیں۔ صرف اردو اکاڈمی، دہلی ایسا واحد ادارہ ہے جو ثقافت کے فیوض و برکات سے آگاہ ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے تہذیبی سرگرمیوں میں بھی ملوث رہتا ہے۔ یوں تو اردو اکاڈمی، دہلی مشاعرے، موسیقی (غزل گائیکی)، ڈرامے وغیرہ کرواتی رہتی ہے لیکن ابھی اس نے لال قلعہ کے سبزہ زار پر ایک پانچ روزہ ''اردو وراثت میلے'' کا انعقاد کیا جسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنی نوعیت کا یہ میلہ بار پہلی محکمہ آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، دہلی کی جانب سے اکادمی کے زیر اہتمام 16 تا 20

نومبر جاری رہا۔ اردو کے بڑے ادیب و دانشور پروفیسر اختر الواسع اکیڈمی کے نائب چیئر مین ہیں اور زبان کی کی ہمہ گیر ترقی میں ثقافت کے کردار سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے صحیح کہا ہے کہ دہلی سرکار کی سرپرستی اور اکاڈمی کی کوششوں سے آج اردو اس قلعہ کی دہلیز تک آ گئی جہاں سے اردو کا آغاز ہوا تھا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اختر الواسع اور اکیڈمی کے فعال سکریٹری انیس اعظمی صاحب نے دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کو اس ثقافتی معرکہ آرائی کے لئے آمادہ کر لیا۔ محترمہ شیلا دکشت ایک بہت باعمل، منظم سیکولر لیڈر ہیں اور اردو زبان سے بیحد پیار کرتی ہیں۔ اپنے آہنی عزم اور انتظامی صلاحیتوں سے انھوں نے واقعی دہلی کو ایک نیا چہرہ دیا ہے۔ ان کے ایک لائق وزیر رما کانت گوسوامی کے بقول شیلا جی نے فن وثقافت کا احیاء کیا ہے اور دہلی کی گنگا جمنی تہذیبی ورثہ کی بازیافت کی ہے۔

لال قلعہ کے سبزہ زار پر منعقد اس میلے میں پانچوں دن رنگا رنگ پروگرام پیش کئے گئے۔ گروپ سانگ، قوالی، ایک مشاعرہ کی تمثیل جو 1824 اور 1853 میں لال قلعہ کے اندر ہوا تھا جس میں مرزا غالب اور استاد ذوق میں معاصرانہ چشمک اردو ادب کا ایک روشن باب بن چکی ہے۔ پھر ایک باضابطہ مشاعرہ نیز غزل سرائی کے مختلف کلاسیکی اور نیم کلاسیکی پروگرام، قوالیوں کی تقریبات جن میں امیر خسرو کے قول اور ترانے پیش کئے گئے۔ یہی نہیں چہار بیت کے مقابلے بھی پیش کئے گئے۔ مختلف اسکولوں کے طلبا و طالبات نے پروگراموں میں حصہ لیا۔ اردو کتابوں اور خطاطی و دستکاری کی نمائش کے علاوہ دہلی کے مقلائی کھانوں کے اسٹال اور جھولے بھی لگائے گئے۔ اردو وراثت میلے میں ہزاروں لوگوں نے بڑے جذبے سے شرکت کی۔ غیر ملکی سیاح بھی ناظرین میں شامل رہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو خود ایک مثبت اور منظم منصوبے کے تحت اردو کی ترقی کے لئے نت نئے تعمیری پروگرام لے کر آگے بڑھتے رہنے کا قابلِ رشک ریکارڈ قائم کر چکے ہیں، نے بالکل درست فرمایا کہ اردو وراثت میلے کے ذریعہ دہلی اردو اکاڈمی ماضی کی جلوہ گری کر رہی ہے۔

ہم ''اردو وراثت میلے'' کی زبردست کامیابی پر اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت، پروفیسر کرن والیہ وزیرِ فلاح و بہبود برائے خواتین، اطفال و السنہ حکومت دہلی، پروفیسر اختر الواسع نائب چیرمین اکادمی، جناب انیس اعظمی سکریٹری اور اکاڈمی کی فعال انتظامیہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ سال اس پروگرام کو مزید خوبصورت اور بامعنی بنانے میں وہ کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔

دیگر اکیڈمیوں کو اردو اکاڈمی، دہلی کی اس تعمیری کارکردگی کی تقلید کرنی چاہئے۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی نئی کمیٹی کو تشکیل ہوئے سات ماہ ہو چکے لیکن اب تک اس میں پہلا قدم اٹھانے کی بھی سکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں یہ مرغی انڈے کب دے گی؟۔

●●

ف۔س۔اعجاز

ٹیگور کے گیت

اس مضمون میں ٹیگور کے گیت جاوو ساہا کے انتخاب "Songs of Rabindranath Tagore" سے لئے گئے ہیں۔ قوسین میں گیتوں کا ترتیب نمبر لکھ دیا گیا ہے۔ مرتب نے بنگلہ گیتوں کے اپنے انگریزی ترجمہ کے ساتھ رومن اسکرپٹ میں بنگلہ متن بھی شامل کردیا ہے۔ میں نے انگریزی ترجمے کے مقابل رومن اسکرپٹ کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ بنگلہ زبان کی اپنی محدود شدھ بدھ کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو ترجمہ اصل سے زیادہ قریب ہے۔ ساہا کے مضمون کے علاوہ ٹیگور کے 150 ویں سالِ پیدائش کے دوران انگریزی اخبارات و رسائل میں چھپے کئی مضامین، انٹرویوز، کتابوں پر تبصرات اور ٹیگور کی یاد میں جاری تقریبات کے معروضات اور ٹیگور کے مضمون "Music And Feeling" سے بھی استفادہ کیا ہے جس کا ترجمہ میں ''موسیقی اور احساس'' کے عنوان سے ماہنامہ انشاء کے ''سلور جبلی۔ ٹیگور نمبر'' میں پیش کر چکا ہوں۔

ف۔س۔اعجاز

رابندر ناتھ ٹیگور کے نغمات کو بنگال کے لوگ رابندر سنگیت کے نام سے جانتے ہیں۔ ٹیگور کے گیتوں کی گونج بنگال میں آج بھی ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ ان گیتوں کی مٹھاس عوام کو لبھاتی ہے۔ اور ان کا دیہی پس منظر موسموں اور پھلوں پھولوں سمیت انھیں ارضیت سے باندھے رکھتا ہے۔ رابندر سنگیت کا تنوع بجائے خود حیرت انگیز ہے۔ مہا کوی ٹیگور کے گیت احساسِ الوہیت، جذبۂ عشق، فطرت پرستی، حب الوطنی کے علاوہ زندگی کی عام کیفیات میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان گیتوں کے آبشار میں بنگلہ زبان سے جڑے ہوئے لوگ ایک ترنگ سے نہاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان گیتوں کا منبع رابندر ناتھ کی اپنی زندگی ہے۔ چنانچہ ان کے نغموں کے محرکات اور تخلیقی اجزا اُن کی اپنی زندگی اور چمنستانِ فکر و خیال میں ہی دریافت کئے جاسکتے ہیں۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ رابندر ناتھ ٹیگور جیسا فن کار صرف دیبندر ناتھ ٹیگور کے گھرانے میں ہی جنم لے سکتا تھا جس کا ثقافتی تموّل ایسا تھا کہ جس پر صدیاں رشک کریں۔ رابندر ناتھ نے بنگال کے ایک بہت امیر اور مہذب انسان کے یہاں 1861 میں جنم لیا۔ یعنی ان کی پیدائش 1857 کی پہلی جنگِ آزادی کے چار سال بعد ہوئی۔ پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہی برطانیہ نے ہندوستان پر راست حکومت شروع کی تھی۔ رابندر ناتھ کا انتقال برٹش رُول کے خاتمے سے چھ سال قبل 1941 میں ہوا۔ لہٰذا ٹیگور کا عرصۂ حیات برطانوی نو آبادی کے طور پر ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ بنگالی نشاۃ ثانیہ کا آغاز رابندر ناتھ کے جنم سے پہلے راجہ رام موہن رائے سے شروع ہوا۔ لیکن اس تحریک کا مرصّع تاج ٹیگور ہی کے سر پر رکھا دکھائی دیتا ہے۔ اور بلاشبہ بنگالی نشاۃ ثانیہ میں ٹیگور خاندان ہی سب سے زیادہ سرگرم ثابت ہوا۔ بنگالی ثقافت کو سب سے زیادہ مالا مال اسی خاندان نے کیا۔ اس خاندان میں ایک سے ایک دانشور، فلسفی، شاعر، موسیقار، ڈرامہ کار تھے۔ ان لوگوں کے اپنے ادبی ورکشاپ ہوتے تھے، رسالے نکلتے تھے۔ جب کلکتہ میں تھیٹر نہیں تھا تب رابندر ناتھ کے ایک بڑے بھائی جیوتر ابندر ناتھ (جیوتندر ناتھ) نے جوڑا سانکو میں اپنے آبائی مکان پر ڈرامے کرنا شروع کئے۔ وہ لوگ اپنے ڈرامے خود لکھتے اور انہیں سنگیت کے ساتھ مکمل بھی کرتے تھے۔ جیوتر ابدر ناتھ کی بیوی کادمبری دیوی نے اپنے دیور رابندر ناتھ کی شعوری بالیدگی میں بڑا رول ادا کیا۔ ٹیگور کی ایک بہن سؤرنو کماری دیوی کسی جدید ہندوستانی زبان کی اوّلین خاتون افسانہ نگار تھیں۔ ٹیگور کے باپ دیبندر ناتھ کے بھائی کی نسل سے ہندوستان کے دو غیر معمولی فن کاروں گگنیندر ناتھ ٹیگور اور اَبانندر ناتھ ٹیگور نے جنم لیا۔ اَبانندر ناتھ جدید ہندوستانی مصوری کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

رابندر ناتھ کے والد دیبندر ناتھ برہمو سماج کے قائدوں میں سے تھے۔ برہمو سماج کی تحریک راجہ رام موہن رائے نے شروع کی تھی۔ یہ تحریک اُپنشدوں کے فلسفۂ وحدانیت پر مبنی تھی اور شرک، بُت پرستی اور ہندوؤں کے روایتی طرزِ پرستش کی مخالف تھی۔ ہندوؤں کے مروجہ طبقاتی نظام کی بھی حامی نہیں تھی۔ جب کلکتہ میں انگریزی تعلیم کا رواج شروع ہوا تو نوجوان ہندو مغربی افکار قبول کرنے اور عیسائی مذہب اختیار کرنے لگے۔ برہمو سماج نے

اس رجحان کی مخالفت کی۔ ہندومت کا اساسی فلسفہ اور اُپنشدوں کی تعلیمات ہی برہمو سماج کی اصلاحی تحریک کی بنیاد بنے۔ اُس دور کے متوسط طبقے کے بہت سارے لوگوں اور نشاۃ ثانیہ کے کئی لیڈروں نے برہمو سماج میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان میں دیپندر ناتھ کی حیثیت زیادہ نمایاں تھی اور رابندر ناتھ بھی بڑی حد تک اپنے باپ کے زیرِ تربیت تھے۔ لیکن تیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے رابندر ناتھ نے برہمو سماج تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حالانکہ اب بھی وہ اپنے باپ کی تعلیمات کے اثر سے آزاد نہیں ہوئے تھے اور راجہ رام موہن رائے سے بھی اُن کی عقیدت برقرار تھی۔

راجہ رام موہن رائے کا خدا غیر ذاتی یا لاشخص (Impersonal) ہستی تھا۔ اس کی کوئی شکل وصورت نہ تھی۔ دنیا میں جو کچھ تبدیل ہو جانے والا ہے وہ بھی اس ہستی کے تصور میں پنہاں وموجود تھا۔ جیسا کہ ایش (یعنی ایشور) اُپنیشد میں مرقوم پہلے شعر میں بیان ہوا ہے۔ جس کے قائل خود رابندر ناتھ تھے۔ اسے ''ویدانت کا براہمن'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک موہوم سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن رابندر ناتھ کا خدا ایک شاعر کا خدا تھا۔ شاید وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے تھے کہ ان کا دھرم ایک شاعر کا دھرم تھا۔ اپنے فنکارانہ اور ثقافتی پس منظر کے تموّل پر انہوں نے کبھی کسی غرور یا بانکپن کا اظہار نہیں کیا لیکن ان کی تخلیقات اُن کے اس نظریہ کو ظاہر کرتی ہیں کہ خدا کی وحدانیت اور اس کی تخلیق اور آہنگ میں تمام چیزیں سموئی ہوئی ہیں جس سے نفرت، ناروا داری، ناانصافی اور جبر واستبداد کا رَد ہو جاتا ہے۔ مادّیت اور روح، ہمیشگی اور عارضیت، یا زمانیت و ماورائیت اور فطری وطبعی وجود کا باہمی کھیل ہی رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریروں کا موضوع رہا اور یہی ان کے گیتوں سے بھی واضح ہے۔

جھلمل مکھرجی پانڈے 21 جولائی 2011 کے ٹائمز آف انڈیا کے کلکتہ ایڈیشن میں لکھتی ہیں کہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ جب ٹیگور نوجوان تھے اور برہمو سماج کے ممبر تھے اُس وقت اُن پر برہما سنگیت یعنی بھکتی گیت لکھنے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا تھا جبکہ وہ اکثر اس تجربے سے ناخوش ہوا کرتے تھے۔ جب انکے اپنے روحانی افکار کافی پختہ ہو گئے تو وہ اپنے ہی تصورات میں سرشار رہنے لگے۔ حالانکہ کبھی کبھی خدا کے بارے میں تشکیک آمیز خیالات بھی اُن کے دل میں آتے تھے۔ بہر حال ہستیٔ معبود پر غور وفکر سے ہی ٹیگور کو زندگی کی قوت حاصل ہوتی تھی۔ اور اپنے فکری تسلسل میں وہ موحّد تھے۔ ایک خدا کو مانتے تھے۔ شانتی نکیتن میں ہر روز دو پرارتھنا بیٹھکوں میں وہ شریک ہوا کرتے اور ایک تقریر یومیہ کرتے تھے جس میں وہ اپنی تلاش وکشف کا بیان فرماتے تھے۔ پھر بھی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ویدانت کے شنکر آچاریائی مکتب فکر کے قائل نہیں تھے۔ اُس کے برعکس انکے ذہن پر ویشنو دوئیت کا فلسفہ غالب تھا۔ اور وہ بھکتی پتھ کے راہی تھے۔ بھگوان ویشنو کے پجاریوں کی طرح وہ برتر حقیقت (Super reality) اور فرد کی روح کو ایک دوسرے سے جدا تصور کرتے تھے۔ آتما کی انسانی تجسیم (Incarnation) میں اُن کا اعتقاد تھا۔ رابندر ناتھ کے نزدیک خدا ان کا مالک، دوست اور محبوب تھا مگر اُن کے وجود سے الگ تھا۔ کہیں کہیں شاعر اپنے گیتوں میں اپنے آقا کے قریب نظر آتا ہے جبکہ حقیقتاً وہ اس تک پہنچا نہیں ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ خدا اُس کے دل میں کئی شکلوں میں، کئی ناموں سے نمودار ہوتا ہے ہر چند کہ اُس نے اُسے کسی روپ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے۔ وہ رب کی موجودگی کو اپنے چلنے پھرنے، اپنے جاگنے سونے میں محسوس کرتا ہے۔ ٹیگور کے ایک گیت کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

''آنکھیں تجھ کو دیکھ نہ پائیں لیکن تُو آنکھوں میں
دل تجھ کو پہچان نہ پائے لیکن تو ہے دل میں

تو ہے میری روح کے اندر، بدل نہیں سکتا
جاگا ہوا ہے اور بیدار
میری نینداور میرے خواب میں تُو میری خاطر''-----

جب موسم گرما کے شعلہ پوش تیر دل میں آکر لگتے ہیں اور راتوں میں نیند نہیں آتی، چبھتی گرمی کے دن ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں اُس وقت بھی رابندر ناتھ کو موسم کی تباہ کاری میں خدائے رحیم وکریم کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ اُس وقت خدا گرمی کی تپش کے ذریعہ زمین کی صفائی اور تجدید کی خاطر آنے والے برسات کے موسم میں نئے برگ وبار اُگانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے۔

رابندر ناتھ کو خدا کی ذات میں وہ یقینِ کامل ہے کہ انہیں غم، موت یا اُنس ومحبت رکھنے والوں سے جدائی بھی خدا کی رضا معلوم ہوتی ہے۔ یہ صدمات اُن کی نظر میں شخصی اور عارضی ہیں جبکہ زندگی کا بہاؤ دائمی ہے۔ سورج، چاند، ستارے مسکراتے رہتے ہیں۔ بسنت رُت کئی رنگ اپنے ساتھ لئے آتی ہے۔ پھول مرجھاتے ہیں، جھڑتے ہیں اور پھر کھل اٹھتے ہیں۔ یعنی سطحِ وجود پر دنیا کو خسارہ نہیں ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ ایک گیت میں کہتے ہیں:

''دکھ ہے، موت ہے، جدائی کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے
پھر بھی امن ہے، پھر بھی مسرت ہے،
پھر بھی اَن اَنت ہے جو جاگا ہُوا ہے
پھر بھی جاری جیون دھارا، ہنسیں سورج، چاند، ستارہ

بسنت بہت سارے رنگ لئے آتا ہے
لہریں مٹتی ہیں، لہریں اٹھتی ہیں۔
کُسم جھڑتے ہیں، کُسم پھوٹتے ہیں
فنا کہیں نہیں ہے، خاتمہ کہیں نہیں ہے'' (گیت:1)

یہ گونجیں شاعر کے یہاں بار بار سنائی دیتی ہیں:
''بے کراں مسرت ختم ہوئے بنا بہتی رہتی ہے
ایک آواز بغیر آغاز کے
اس آسمان میں گونجتی ہے جسکی انتہا نہیں ہے
سورج، چاند، ستارے بے حد وحساب
صرف اور صرف ایک لافانی خدا ہے
جو ایک دائمی مخلوق پر حکمرانی کرتا ہے۔'' (7)

شاعر کے نزدیک موت ایک رفیق ہے، بندھو ہے جس کا استقبال کیا جائے۔ ایک گیت کے یہ بول دیکھیں:
''اگر میرے غم کے اندھیرے میں ہو جائے مدھم سا بھی ایک تیرا اُجالا
تو ہو جائے وہ
اگر موت پہنچا دے مجھ کو وہاں تک جہاں تیرا گھر ہے سدا رہنے والا
تو ہو جائے وہ (11)

ٹیگور نے ایک اور جگہ موت کو دلہن سے تعبیر کیا ہے جو اپنے شوہر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آسمان سے آتی ہے۔ ٹیگور نے موت یا فنا پر کچھ بہت خوبصورت گیت لکھے ہیں۔ انھوں نے نیستی کے معمہ سے متعلق پُر اثر سنگیت بھی دیا ہے۔ کشور چٹرجی نے 25 جنوری 2011 کے ''دی ہندو'' اخبار کے دہلی ایڈیشن میں اپنے مضمون "Rooted to the core" میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ حال میں امریکہ میں معیادی بیمار لوگوں کے ایک سَروے میں اُن سے پوچھا گیا کہ بیماری کے دوران کون سے فنی تاثرات انہیں سب سے زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ مریضوں کا جواب تھا ''ٹیگور کے گیت''۔
رابندر ناتھ کو شب و روز قربِ الٰہی کی تلاش رہتی ہے۔ ایک گیت میں کہتے ہیں:

''جب دنیا نیند میں ہوتی ہے
اور آسمان گہرا نیلا
کون ہے وہ جو اپنا کول ساز چھیڑ کر

میری بینا کو ایک میٹھی بھڑک دار دُھن میں پہنچا دیتا ہے؟
میری آنکھوں کو بے خواب کر دیتا ہے
میں بستر سے بے چین اُٹھ جاتا ہوں
کھلی آنکھوں سے میں اس کا استقبال کرتا ہوں
لیکن میں اُس سے مل نہیں پاتا ہوں''۔ (9)

شاعر خدا کے روبرو نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے گیتوں سے ہی اس کی پہچان قائم کر لیتا ہے:
''جب میں دنیا کو اپنے بھجن سے دیکھتا ہوں
میں اُسے پہچان لیتا ہوں، میں اُسے جانتا ہوں''۔ (12)

زندگی اور موت رابندر ناتھ کے نزدیک ایک تسلسل کے دو رُخ ہیں جسے زندگی کہا جاتا ہے۔ وہ موت کو محبت سے گلے لگا سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک دن ڈوبتا سورج اپنی آنکھوں میں آخری اداس مسکراہٹ کے ساتھ انہیں الوداع کہے گا اور دنیا پہلے ہی کی طرح اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں کے سامنے سورج کے آخری بار غروب ہونے سے پہلے چند ازلی سوالات کا جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک گیت میں لکھا ہے:

''یہ میری درخواست ہے تم سے، اس سے پہلے کہ میں جاؤں
کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ یہ جو نیچے ہری زمین ہے
آسمان کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھا کر مجھے اس طرح کیوں پکارتی ہے؟

رات کی خاموشی نے اتنے روشن ستاروں
کی جانب سے کیا الفاظ کہے تھے؟
دن کی تابندگی میرے دل میں اس طرح کیوں ناچ اُٹھی تھی؟
اس کا جواب، میرے آقا میں تجھ سے دینے کی التماس کرتا ہوں''(18)

شاعر اس سے بخوبی واقف ہے کہ اُس کا جسم فانی ہی سہی اُس کی روح کو فنا نہیں ہے۔ ایک گیت کے بول ہیں:

''جب میرے قدموں کے نشان اس راستے پر نہیں پڑیں گے
خرید و فروخت سب بند ہو جائے گی
اِس بازار میں
کوئی نشان میں نہیں چھوڑوں گا

تب میرا حافظہ کچھ یاد نہیں دلائے گا
ستاروں کو تکتے ہوئے تمہیں میرا نام پکارنے کی ضرورت نہیں ہوگی

....

کون کہہ سکتا ہے میں اُس صبح وہاں نہیں ہوں گا؟
میں تمام مسرتوں میں اُچھلتا کودتا ملوں گا
تم مجھے ایک نئے نام سے پکاروگے
نئے بازو میرے نئے ڈھانچے کو خود سمیٹ لیں گے''۔ (97)

ٹیگور کے گیتوں کو کئی شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے خصوصاً پوجا، پراکرتی (فطرت)، سوادیش (مادر وطن)، پریم، بِدھا میں۔ لیکن پوجا کے ذیل میں جو گیت آتے ہیں وہی ٹیگور کی روحانیت کا جوہر ہیں۔ یہ گیت اُن کے مُصوّرہ "جیوَنا دیوتا" کے گرد گھومتے ہیں۔ ٹیگور نے 1939 میں خود اِن گیتوں کو 20 فصلوں میں تقسیم کیا تھا مثلاً گان، بندھو، پرارتھنا، برہا، سادھنا، دُکھو، اُشواس۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ رابندر ناتھ نے صرف قربِ الٰہی، ہستی یا نیستی اور اُلفت کے نغمے ہی بُنے۔ جہاں نفرت اور تشدد کو دنیا میں سر اُٹھاتے دیکھا وہاں انھوں نے ایسے گیت بھی لکھے:

''تشدد کے ساتھ دنیا پاگل ہوگئی ہے
ہر روز ایک نئی جنگ کا اضافہ کرلیتی ہے
اِس کا راستہ تہہ دار اور پیچیدہ ہے
لالچ کے اُلجھاوے میں ڈالنا اس کا کھیل ہے
تیرے نئے جنم کے لئے تمام مخلوقات اب بے چین ہیں
اے مہان آتما
عنایت فرما
اپنا پیغامِ بے مرگ ارسال فرما
اپنے پیار کے کمل کو کھل جانے دے تاکہ اس کا نقطار بہہ نکلے
اے خاموش، آزاد، رحیم، بے انتہا قدرت والے
دنیا کو خوفناک ذلّت سے نجات دلادے''۔ (13)

ٹیگور نے زمین اور مظاہرِ فطرت سے اٹوٹ پیار کیا ہے۔ پھول، شجر، دریا، فصلوں بھرے کھیتوں سے ٹیگور کا اُنس اُن کے گیتوں میں جا بجا ظاہر ہوا ہے۔ لوگ جس طرح ان نظاروں، کھیتوں، موسموں سے انبساط حاصل کرتے ہیں اس کی تصویر کشی بھی ٹیگور کے نغمات میں ہوئی ہے۔ شاعر فطرت کے نظاروں میں محو ہو جاتا ہے۔ فطرت سے اس کا رومان فرضی یا تخیلی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ٹیگور فطرت کے حسن وعظمت سے اپنے گیتوں کو بخوبی آراستہ کرلیتے ہیں:

''آسمان اَن گنت سورج اور ستاروں سے اٹا پڑا ہے
دنیا زندگی کی لاتعداد شکلوں میں صف آرا ہورہی ہے
اُن کے درمیان میں جی رہا ہوں
اور انہی کے رعب وجلال کے زیر اثر میں گا رہا ہوں'' (41)

کشور چٹرجی نے اپنے مذکورہ انگریزی مضمون میں لکھا ہے ''ٹیگور ولیم ورڈز ورتھ کی فطرت کے بڑے پرستار تھے۔ اپنے گیتوں میں وہ پھولوں، ستاروں اور پرندوں سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹیگور کا ایک سحر انگیز گیت پنجرے میں قید ایک پرندے اور ایک آزاد پرندے کے مابین مکالمے پر مبنی ہے۔ ٹیگور بارش، دھوپ، چاندنی جیسے اجزائے فطرت کو گیتوں میں ڈھالتے ہوئے لازماً رومانی ہو جاتے ہیں''۔

(روزنامہ ''دی ہندو''۔ 25 جنوری 2011)

کائنات پر آتے جاتے موسموں کا جو اثر ہوتا ہے اور ان موسموں سے فضاؤں اور انسانی مزاج میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اپنے گیتوں میں رابندر ناتھ اُن سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بنگال میں بیسا کھ کے موسم پر اُن کا ایک گیت ہے۔ اس کا یہ ٹکڑا دیکھیں:

''دھڑک میرے دل! میرا خیال ہے وہ آرہی ہے
بیساکھ کا طوفان نزدیک ہے
پُر مسرت طیش کے ساتھ وہ آرہی ہے
تمام رکاوٹوں کو توڑنے کا جنون لئے
غضبناک بھیس میں تمہارا محبوب آرہا ہے
آسمان اس کے کالے آثار میں ڈھکا ہوا ہے
میرا خیال ہے تمہارا تمام حوصلہ اور آرزومندی
پوری تباہی کی شکل میں اب سامنے آپہنچے ہیں'' (53)

موسم گرما جب تپش اور لو سے زمین کو خشک کر کے، پیڑوں پتوں کو اجاڑنے کے بعد برسات کو راہ دیتا ہے تاکہ ایک نئی تخلیق کا عمل شروع کرے تو شاعر ان سب تبدیلیوں کو اندر کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اپنے دل و دماغ میں موسموں کی اِن اداؤں کو بسالیتا ہے۔ اساڑھ مہینے سے بارشیں شروع ہوتی ہیں۔ بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ تب اُفق اپنے گلے میں کبھی کبھی ان بجلیوں کا مرصّع ہار پہنا دکھائی دیتا ہے۔ بارش زمین کو پھر سبز و شاداب کر دیتی ہے۔ فصل پھر لہلہانے

لگتی ہے۔ پھول دوبارہ کھلنے پر آتے ہیں۔ لیکن یہی بارش سیلاب میں تبدیل ہو جائے تو لوگوں کے لئے تباہی بھی لاتی ہے۔ گویا ایک ہی موسم کسی کا ہمدم بن سکتا ہے اور کسی کا دشمن۔ ایسے موسم سے اپنے ایک گیت میں شاعر مخاطب ہے:

''تو بھیگی زمین پر
اپنی سبز قوت کا نقطار نچوڑ دیتا ہے
لیکن تیرا بایاں ہاتھ خون آلودہ ہے
ظالمانہ موت اور ہلاکت خیز طوفان سے'' (46)

برسات میں جب شاعر گھر میں اکیلا محبوب کی یاد میں تڑپتا ہے تو اپنی بے صبری کو گیت میں یوں ڈھال دیتا ہے:

''اس طوفانی رات میں
یہ تمہارے پیار کا لمس ہے
میری انیس روح
میری رفیق
آسمان مصیبت میں بین کر رہا ہے
اور میری آنکھیں بے خواب ہیں
میں اپنا دروازہ کھول کر
میری پیاری
بار بار تمہیں تلاش کر رہا ہوں'' (40)

یہ انتظار اور بے قراری ٹیگور کے برسات کے گیتوں میں اپنا کرشمہ دکھاتے ہیں۔ لیکن ہر موسم کی طرح یہ موسم بھی پائدار نہیں ہے۔ موسلا دار مینہ اور پیہم بجلیاں برسانے کے بعد موسم باراں رخصت لیتا ہے اور خزاں کا موسم چلا آتا ہے۔ آسمان نیلا، میدان ہرے، فصلیں آراستہ ہونے لگتی ہیں۔ ایک گیت میں ٹیگور اس دلکش موسم کا استقبال یوں کرتے ہیں:

''نرم ہوا سفید کشتیوں میں کتنی صاف ہے
ایسی کشتی رانی میں نے کبھی نہیں دیکھی
کتنی دُور کی زمینوں کے خزانے یہ کن سمندروں سے لاتی ہیں؟
اِس خیال سے میرا تصور اُڑنا چاہتا ہے
اور اس ساحل پر یہ تمام چاہنے اور پانے کی خواہش کو چھوڑ دینا چاہتا ہے'' (42)

جب بہار کی آمد ہوتی ہے تو درختوں پر نئے پتے نکلتے ہیں۔ آم کے باغات میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ شاعر کو فطرت میں نئی زندگی کا یہ ارتعاش لبھاتا ہے۔ ایک گیت کے بول متوجہ کرتے ہیں:

''میری بینا پر کونسی دُھن کس نئے چنچل سُر میں بج رہی ہے؟
میرا من آج اپنی دھڑکنوں پر کانپ رہا ہے

....

جنگل خوشی سے دھڑک رہا ہے
رقصِ تجلی کی تال کے ساتھ'' (59)

رابندر سنگیت نے موسموں کی خوش ادائی اور خوش نوائی سے جو آہنگ پایا وہ شاعر کے محسوسات کا طلسم ہے۔ لیکن ٹیگور صرف فطرت کے دلدادہ نہیں، ایک وطن پرست بھی تھے اور موسموں کی رنگا رنگی کے علاوہ وطن کی محبت سے بھی سرشار تھے۔ 1905 میں بنگال کی تقسیم ہوئی تو اس کی مخالفت میں جو تحریک چلی اُس میں رابندر ناتھ بہت سرگرم رہے۔ 1919 میں جب جلیاں والا باغ، امرتسر میں برٹش سرکار کے خلاف پُر امن احتجاج میں تقریباً چار سو مرد، عورتوں اور بچوں کا ظالمانہ قتل ہوا تو رابندر ناتھ نے اپنا سر کا خطاب انگریز سرکار کو لوٹانے میں ذرا دیر نہ کی۔ [1] بھارت کے پسپا ہوتے ناگرک کو ایک وقت انہوں نے اپنے مشہور عام گیت ''ایکلا چولو رے......'' سے ڈھارس دی۔ وہ حوصلہ افزا پکار یہ تھی جسے سن کر آزادی کے متوالے انگریزوں

---

[1] کلکتہ کے انگریزی روز نامہ ''دی ٹیلی گراف'' کے جمعہ 9 ستمبر 2011 کی اشاعت میں صفحہ 15 پر بھاس وتی چکرورتی کا اتمیں داس گپتا کی مرتبہ کتاب "A Tribute To Rabindranath Tagore:Glimpses From Archival Records" پر ایک وقیع تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں ایک دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے کہ ٹیگور اپنی جوانی میں پولس کی نظر میں مشتبہ بن گئے تھے۔ یہ بات ٹیگور نے ایزرا پونڈ (Ezra Pound) سے کہی تھی کہ وہ کچھ عرصہ پولس ریکارڈ میں "Suspect No.12 Class B" کے طور پر مندرج فہرست رہے۔ بعد میں شانتی نکیتن میں ان کا نام "Ex-suspect" کی فہرست میں درج کر لیا گیا۔ اس شک کا باعث ٹیگور کے وطن پرستانہ خیالات ہی ہو سکتے تھے کیونکہ راس بہاری بوس جیسا دیش پریمی بھی وشوا بھارتی سے وابستہ تھا۔ جہاں شبہ کی بنیاد پر انقلابی اور دہشت گردانہ سرگرمیوں کے بارے میں خفیہ پولس ایک فائل بنا چکی تھی جس کا نمبر 285/1925 تھا۔ اس فائل کی رپورٹ کے سرنامہ پر جے۔ ای۔ آرمسٹرانگ کا دستخط ہے اور اس کی آخری عبارت یہ ہے:

"........That Dr.Tagore repudiated the title conferred on him by the King Emperor is in itself sufficient indication,I should say of the tenor of the school and its ideas of loyalty."

سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے سڑکوں پر نہتے چلے آتے تھے:

''تیری آواز پر جو کوئی نہ آئے تُو تُو تنہا چل بھئی
تنہا چل، تنہا چل، تنہا چل بھئی

کوئی گر بات نہ کرے، ارے ارے او ابھاگے
ہر کوئی منہ پھرا لے، ہر کوئی کرے بھئے
ایسے میں پران کھول
ارے منہ کھول، ترے من میں جو ہے تنہا بول بھئی'' (66)

ٹیگور کے گیتوں میں سے دو کو خود جذبۂ وطن پرستی نے اعزاز بخشا ہے۔ ان دو میں سے ایک ہندوستان اور ایک بنگلہ دیش کا قومی ترانہ ہے۔ ''جن گن مَن'' آج ایک سو بیس کروڑ ہندوستانیوں کی خودمختاری اور آزادی کے احترام کی علامت ہے۔ جسے اسکی مخصوص آرکسٹرائی ترتیب اور آہنگ سے دنیا دور سے پہچان لیتی ہے۔ دوسرا گیت بنگلہ دیش کا قومی ترانہ ہے: ''اَمار سونار بانگلا، اَمی تمائے بھالو باشی''۔

ٹیگور اپنے وطن سے اس کی غریبی اور پچھڑے پن کے باوجود بہت پیار کرتے تھے۔ وہ سارے بھارت کو اپنی گود تصور کرتے تھے۔ ان کے ایک گیت کی یہ جھلک دیکھیں:

''سارتھک (سپھل) جنم میرا ہوا اس دیش میں
سارتھک جنم لیا تیرے پیار کے لئے، ماں میں آسودہ ہوں
تیرے دَھن رتن کی مجھے خبر نہیں
کیا وہ کسی رانی کی انمول دولت جیسے ہیں؟
میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ جب
تیری گود میں ہوتا ہوں اُس وقت میں مطمئن ہوتا ہوں'' (69)

ٹیگور کے گیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی مثالیت (آئیڈیلزم) کا نظریہ عام قومی جدوجہد کے نظریہ سے مختلف تھا۔ اُن کے حب الوطنی کے نغموں میں لفظوں کی بھرمار کے بجائے ایک شاندار قوتِ ارادی دکھائی دیتی ہے۔ ایک گیت میں ملاح سے کہتے ہیں:

''جھکڑ آنے دے۔ طوفان اُٹھنے دے۔ پھر لوٹوں گا نہیں ایکبار
تجھے کرتا ہوں نمسکار
میں بلا خوف کشتی میں سوار ہوا ہوں تاکہ کردے تو مجھے اُس پار
تجھے کرتا ہوں نمسکار (65)

اس ذکر کو موقوف کر کے اب ہم ٹیگور کے پریم گیتوں کی طرف آتے ہیں۔ رابندر ناتھ کے نغماتِ محبت بڑے جادو اثر ہیں۔ جس اُلفت کے گیت انہوں نے گائے وہ ایک مرد اور عورت کے روایتی تعلق کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ وہ اس سے متجاوز ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خاص روحانی سرجوشی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ ٹیگور کے محبت کے گیتوں میں کئی ایسے گیت شامل ہیں جنھیں بھکتی گیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ بیشک اِن میں محبوب اپنے محبوب میں کھو گیا ہے، پگھل گیا ہے لیکن اِس انتہائی سپردگی کے باوجود اِن گیتوں میں ارفع روحانی رفاقت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک گیت کا یہ اقتباس دیکھیں:

''گیت کے بندھن کے ساتھ میں نے اپنی آتما کو تجھ سے باندھ دیا ہے
میں نے تجھے ایک لاشعوری تلاش میں پایا ہے،
کیا تجھے یہ معلوم ہے؟.................
پھاگن کی روشنی میں
میں تیرا بے مثال ہیولیٰ رکھتا ہوں
اپنی بانسری سے میں ''للت۔ بسنت'' راگ نکالتا ہوں
دُور تیرا سنہرا گلوبند چمک جاتا ہے
اُسی گیت کی تال اُسے متوالا کئے دے رہی ہے'' (76)

شاعر کے دل میں مجازی محبوب کے لئے ویسی ہی بے قراری، انتظار اور سپردگی ہے جیسی کہ معبود کے لئے بھکتی گیتوں میں نظر آتی ہے۔ مجازی محبوب کے لئے ٹیگور نے کئی گیت گائے ہیں۔ یہاں نمونتاً دو گیتوں کے اقتباس پیشِ خدمت ہیں:

(1)

''میرا دل جو چاہے، وہ تم   وہی تم ہو، ہاں وہ ہو تم   بس اک تمہیں*
سوا اک تمہارے اپنا   سارے جگت میں میرا   کوئی نہیں
سُکھ جو نہیں پاؤ تو   سُکھ ڈھونڈنے تم نکلو   جاؤ کہیں
تم میرے من میں ہو تو   کچھ نہ چاہوں گا میں سن لو   کچھ بھی نہیں
تم سے جدا میں رہ کر   رہوں گا تمہارے اندر   کر لو یقیں''

★ یہ الفاظ مترجم کی طرف سے مستزاد ھیں۔

(2)

''ایک دن ہم دونوں باغ میں جھولا جھول رہے تھے
پھولوں کی ڈوریوں سے بندھا جھولا

اُس یاد کو کبھی کبھی اپنے دل میں آنے دیا کرو
اُسے بھولو نہیں، اسے پیچھے نہ چھوڑ و'' (92)

رابندر ناتھ نے تقریباً ڈھائی ہزار گیت لکھے اور انہیں سنگیت بھی دیا۔ ان کے بھکتی اور پریم گیتوں پر بنگال کے ویشنو شعراء کا اثر نمایاں ہے۔ سنگیت میں انہوں نے کلاسیکی ہندوستانی سنگیت کی تربیت لی تھی۔ جب وہ پہلی بار انگلستان گئے تو وہاں انہوں نے یوروپین سنگیت کی بھی تعلیم حاصل کی۔ لیکن وہ وی اینا کی کلاسیکس میں سے بیتھو وین، ہیدن، موزارٹ، شوبیر، براہمز سے عملاً ناواقف تھے۔ سائنسداں البرٹ آئن اسٹائن، ان کے دوست نے پہلی بار انھیں پیانو پر بیتھو وین کی موسیقی سے متعارف کرایا۔ ان کے بعض ابتدائی گانوں کی دُھنیں برطانیہ کے سرحدی ملاحوں اور مور (Moore) کی آئرش دُھنوں پر مرتب ہوئی ہیں۔ گلبرٹ سلیوان (Gillbert Sullivan) کا اوپیرا سنگیت انہوں نے اپنے ابتدائی ڈانس ڈراموں'' کال مرگیہ'' اور'' والمیکی پرتیبھا'' میں استعمال کیا۔ مغرب کے بڑے موسیقار مشہور شعراء کے گیتوں کے دھنیں تیار کرتے تھے۔ اس کے برعکس ٹیگور اپنے گیتوں کے کمپوزر بھی خود تھے۔ اگر ان کی کچھ دھنیں دوسروں نے تیار کیں تو وہ بھی ان کی نگرانی میں تیار ہوئیں۔ بہت سارے گیتوں کی دھنیں انھوں نے کلاسیکی ہندوستانی موسیقی پر کچھ ترمیم کے ساتھ تیار کیں۔ وہ ہندوستانی سنگیت کی قدامت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہیئت اور لفظیات میں کئی انحرافات کو متعارف کیا خصوصاً بنگال کے دیہاتی باؤل اور بھٹیالی سنگیت میں۔ ان کے سنگیت کا فارم اور لفظیات اُن سے اس قدر مخصوص ہیں کہ اتفاقیہ رابندر سنگیت سننے والا (بنگلہ داں) بھی اُن کی طرز یں سُن کر اپنے محبوب گویا شاعر کو پہچان لیتا ہے۔

رابندر سنگیت نے ٹیگور کے بعد کے سنگیت کاروں کو تخلیقی طور پر بہت متاثر کیا۔ ٹیگور نے گیتوں کے ذریعہ سنگیت شاستر کو بڑھاوا نہیں دیا بلکہ ''کابیہ شاستر'' (کویتا شاستر) کو فروغ دیا۔ اور رابندر سنگیت واقعی کویتا اور سُر کا سنگم ہے۔ ٹیگور کا خیال تھا کہ سنگیت کو کویتا سے ملا دینے سے دونوں میں کون چھوٹا ہے اور کون بڑا ہے یہ پتہ نہیں چلتا۔ بنگلہ میں کلاسیکی سنگیت کے ماہرین رابندر سنگیت کو سُر، چھند، تال اور راگنیوں کے انوکھے ملن سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رابندر سنگیت پر چڑھائے گئے کسی کسی گیت کا وزن شکستِ ناروا کا شکار ہو گیا ہے یا لَے ٹوٹ جاتی ہے یا کہیں کوئی سُر صحیح چھند نہیں پا سکا۔ لیکن اکثریت اس پر متفق ہے کہ رابندر سنگیت کی جو حرکتیں (movements) ہیں وہی ٹیگور کے اِس فن کو انمول بناتی ہیں۔

جس طرح ٹیگور کی شاعری جذبہ و تخیل میں شرابور نظر آتی ہے اُسی طرح ٹیگور کے گیتوں پر اُن کی سنگیت کی حسیات کا بہت گہرا اثر ہے۔ اس ضمن میں ٹیگور کے عالمانہ مضمون "Music And Feeling" کا مطالعہ سودمند ہوگا جس کا ترجمہ میں نے انشاء کے ''سلور جبلی۔ ٹیگور نمبر'' میں ''موسیقی اور احساس'' کے عنوان سے کیا ہے (دیکھیں ص 445 تا ص 447 مذکورہ شمارہ)۔ یہ بڑا پُرجلال مضمون ہے جس میں ٹیگور کے صوتی احساسات، لہجے اور ردھم (Rhythm)، لفظوں کی اندرونی اور ظاہری کیفیتوں کی موافقت میں راگ، راگنی اور سُر کے انتخاب میں درپیش فنی مصلحت اور ترجیح کو انہوں نے موثر انداز میں مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رابندر ناتھ احساس کو جبراً راگ کا محکوم بنانے کے مخالف تھے۔ مذکورہ مضمون میں انہوں نے لکھا ہے:

''اگر (سنگیت کی) ساخت میں تبدیلی احساس کے اظہار میں عمدہ تبدیلی لے آئے تو میں اس کا سواگت کروں گا۔ اگر چوتھے سُر کی جگہ پانچواں سُر بہتر آواز پیدا کرتا ہے اور اصل احساس کا زیادہ اچھا اظہار کرتا ہے تو جے جیکتی (راگ) کا چاہے جو ہو جائے میں پانچواں سُر ہی برقرار رکھوں گا۔ کیا میں نے جے جیکتی سے کوئی رشوت لی ہے کہ میں اپنی زندگی کی قیمت پر اُسے بچاؤں؟۔ (ص 446 انشاء کا سلور جبلی۔ ٹیگور نمبر)۔

اس مضمون میں رابندر ناتھ نے یہ بھی لکھا ہے:

(سنگیت کار) ''لفظوں کو سُروں سے اوپر رکھنا چاہئے ہیں۔ وہ سُر تخلیق کرنے کے لئے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ میں لفظ پیدا کرنے کے لئے سُر استعمال کرتا ہوں۔ یہاں گیت کی ترکیب کے بارے میں کچھ کہنا واجب ہوگا...... کسی کو میوزیکل نظم کا کسی عام نظم سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے۔ ایک عام نظم پڑھنے کے لئے ہوتی ہے۔ ایک موسیقانہ نظم سننے کے لئے ...... میوزیکل نظم کو قرأت کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہئے۔ اس کے برعکس ایک بہت عمدہ نظم ہوسکتا ہے کہ عمدہ قرأت نہ پیش کرتی ہو۔ .... ایک گیت سانس لینے جیسا عمل ہوتا ہے، اسے پڑھا نہیں جاسکتا، صرف سنا جاسکتا ہے''۔ (ص 447)

کہا جاتا ہے کہ گیت ترجمہ نہیں کئے جاسکتے۔ کافی حد تک یہ درست ہے۔ سنگیت ایک خطّے کے عوام اور کلچر سے منسوب ایک کلا ہے۔ گیت کے بولوں کا کسی دوسری زبان میں پورے پورے طور پر منتقل کرنا اور اس شرط کے ساتھ کہ سنگیت کی اصل طرز برقرار رہے تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ البتہ گیتوں کو دوسری زبان میں نظموں کا لباس پہنانا شاید ممکن ہوسکتا ہے۔

رابندر سنگیت بہت سوں نے سنا ہوگا اور پسند بھی کیا ہوگا۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو ان گیتوں کے لفظوں کے معانی پوری طرح نہیں سمجھ پاتے۔ جن کے لئے بنگالی زبان اجنبی ہے وہ تو فطرتاً ان گیتوں کو سمجھنے سے قاصر

ہوں گے۔ اب اِن میں وہ بنگالی بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جو بیرونِ ملک مثلاً امریکہ، یورپ، افریقہ وغیرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے لیکن بنگالی زبان کا خاص علم نہیں رکھتے۔ جیسا کہ بیرون ملک بسے تارکینِ وطن کی نئی اردو نسل کے ساتھ بھی ہے۔ بہرحال یہ طے شدہ ہے کہ رابندر ناتھ کے گیتوں کی زبان جانے بغیر رابندر ناتھ کی شانِ نغمہ نگاری کی صحیح داد نہیں دی جا سکتی۔ اور ڈھائی ہزار گیتوں کا ترجمہ اصل بحور و اوزان اور طرزوں کو برقرار رکھتے ہوئے کر پانا بھلا کب ممکن ہوگا؟۔

یوں تو رابندر ناتھ نے کئی نظمیں معرّیٰ اور آزاد فارم میں بھی لکھی ہیں لیکن مقفّیٰ اور باوزن شاعری ہی انہیں بھاتی تھی۔ گانوں میں اُن کا اپنا ایک لفظیات کا نظام اصولی طرز کا تھا۔ ان کے الفاظ کو ذرا بھی تبدیل کیا جائے تو اصل گیت کا آہنگ مجروح ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔

اٹھارویں صدی میں بنگالی شاعری مذہبی موضوعات اور دو تال چھند (بحروں) ''پائز'' اور ''ترِی پدی'' تک محدود تھی۔ مدھو سودن دت (1824-1873) کی رزمیہ شاعری معرّیٰ تھی۔ اور اس کا الگ مقام تھا۔ بہاری لال چکرورتی (1834-1894) کے گیت بھی بنگلہ شاعری میں جدّت کا عمدہ نمونہ قرار دئے گئے۔ البتہ رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پیش رَووں کی شاعری سے بہت آگے نکل گئی۔ وہ جتنے بسیار نویس اور زود گو تھے اتنے ہی جدّت پسند بھی تھے۔ گیتوں میں نت نئی طرزیں اختیار کرنا، نظموں کو تازہ کار بحروں میں موزوں کرنا اُن کی اختراع پسندی کا ثبوت ہے۔ اس سے بنگالی زبان کے تنوع اور وسائل میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے جدید بنگالی زبان کو بنکم چندر چترجی سے بھی زیادہ مالا مال کیا۔

ٹیگور نے نظموں کی طرح گیتوں میں بھی ایسے سادہ الفاظ استعمال کئے کہ انہیں کم پڑھا لکھا بھی با آسانی سمجھ سکتا تھا۔ سہل ممتنع کو کامیابی سے برتنے سے ہی اُن کے گیتوں کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا حالانکہ جو الفاظ ٹیگور نے گیتوں میں استعمال کئے وہ فکر و جذبہ کی سطح پر ایک سے زیادہ معنی کے حامل نظر آتے ہیں۔

ٹیگور کے گیت اُن کے 150 ویں سالِ پیدائش میں بھی بنگال کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ انہوں نے خود یہ پیشگوئی کی تھی کہ جب اُن کے دوسرے سب کارنامے بھلا دئے جائیں گے اُس وقت بھی اُن کے گیت زندہ رہیں گے۔ ان کی بات صحیح ثابت ہوئی ہے!۔

آخر میں اردو قارئین کو یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ وشوا بھارتی یونیورسٹی نے 2000ء تک ٹیگوریات کو کاپی رائٹ سنسرشپ کی ایسی جکڑ میں رکھا کہ وشو کوی ٹیگور خالصتاً اور کلّی طور پر بنگال کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کشور چترجی نے توجہ دلائی ہے کہ ان کی بعض طرزیں اخذ کر کے ہندی فلموں میں استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً ''راہی متوالے'' (گائک طلعت محمود)۔ ''میرا سندر سپنا بیت گیا'' (گائکہ گیتا دت)۔ ''جائیں تو جائیں کہاں'' (گائک طلعت محمود اور لتا منگیشکر)۔ ''تیرے میرے ملن کی یہ رینا'' (گائک کشور اور لتا منگیشکر)۔ ان گیتوں کے کمپوزر سلیل چودھری، ایس۔ ڈی۔ برمن جیسے عظیم موسیقار تھے۔ لوگ ان فلموں کو بھلے ہی بھول چکے ہوں لیکن یہ میلوڈیز آج بھی عوام کی یادوں میں تیر رہی ہیں۔ ●●

بقیہ: ظفر حسن کی ادبی کاوشیں

خدائے بزرگ و برتر کے شکر گزار ہیں۔ 1960ء میں یہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹا ہمایوں ظفر کاروبار سے وابستہ ہے۔ سالہا سال کراچی میں قیام پذیر رہنے والے ظفر حسن گزشتہ 17 برس سے لاہور میں رو رہے ہیں۔ زندگی بھر جن چیزوں سے انہیں گہرا لگاؤ رہا ان میں فارسی شاعری بھی شامل ہے۔ مستقبل میں ایک ہزار سال کی فارسی شعری روایت سے وابستہ شاعروں کے کلام کا ایک مرقع پیش کرنا ان کے منصوبوں میں شامل ہے۔ وہ فارسی شاعر جن کے کلام کو یہ خود کو پڑھنے پر بار بار مجبور پاتے ہیں ان میں وہ شیخ سعدی اور حافظ کا نام لیتے ہیں۔ اردو ادب میں جن ادیبوں کی تحریروں سے متاثر ہوئے ان میں وہ منشی پریم چند، پطرس بخاری، راجندر سنگھ بیدی، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور ان میں سب سے بڑھ کر منٹو کا نام لیتے ہیں۔ انتظار حسین سے اپنے تعلق پر انہیں فخر ہے۔ ان کے نزدیک انتظار حسین ان ادیبوں میں سے ہیں جنھیں ان کی زندگی میں ہی لیجنڈ کا درجہ مل جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کی تحریروں کے بھی مداح ہیں۔ شاعری میں اساتذہ کے کلام کے وہ دیوانے ہیں۔ جدید شعرا میں میرا جی، ن م راشد، مجید امجد، ناصر کاظمی، منیر نیازی، ظفر اقبال، احمد مشتاق اور افتخار عارف، جون ایلیا، امجد اسلام امجد، ایوب خاور، گلزار، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور یاسمین حمید کا نام لیتے ہیں۔ کاروبار اور علمی تگ و تاز کے علاوہ جن دو چیزوں میں ان کی دلچسپی ہے وہ فوٹوگرافی اور سوئمنگ ہیں۔ ●●

ف۔س۔اعجاز

ٹیگور کے سولہ گیتوں کا اردو ترجمہ

[اپنے ترجمے پر ایک نوٹ]

آواز گیت کا جسم ہے تو سُر آواز کی میزان۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی گیت کا ترجمہ اصل دُھن کو برقرار رکھنے کی شرط کے ساتھ بڑا آزمائش طلب کام ہوتا ہے۔ لہٰذا رابندر سنگیت جو گیت اور سنگیت سے مرکب ہے، کا کسی غیر بنگالی زبان میں ترجمہ کرنا یقیناً بہت مشکل کام ہے۔ اور موجودہ زمانے میں جبکہ سنگیت کا فیشن بہت تبدیل ہو چکا ہے اس شرط کو پورا کرنا اور بھی دشوار ہے۔ ٹیگور کے گیتوں کے موضوعات اِن گیتوں میں بسی فضاؤں کے ساتھ بنگلہ کی ہمجولی زبانوں مثلاً آسامی اور اُڑیہ کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو بہو منتقل ہو جائیں اس کا امکان کم ہے۔ اردو میں رابندر سنگیت کا ترجمہ اس لئے اور زیادہ مشکل ہے کہ اردو اصلاً شہری زبان ہے۔ دیہاتی زندگی اور ماحول کی فطری عکاسی میں اردو گیت کسی مقامی بولی مثلاً بھوجپوری، اودھی، پنجابی کا سہارا لئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اردو زبان شاعری کے لئے تو خود کفیل کہی جاسکتی ہے گیت نگاری کے لئے نہیں۔ گیت کو شمال مشرقی، وسطی اور شمال مغربی ہندوستان کے جغرافیائی نیز روایتی دیہی تہذیبی پس منظر کے ساتھ مکمل کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ہندی یا ہندوی پر انحصار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بغیر گیتوں میں رس نہیں آتا۔

ترجمہ محض ایک سے دوسری زبان میں لفظوں کی تبدیلی کا نام نہیں ہے۔ ترجمہ کے مسائل ترجمہ کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔ بنگال میں رابندر سنگیت کو ٹیگور کی اپنی دھنوں میں گانے کی شرط کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔ اس سے ٹیگور کے احترام اور بنگال میں ان کے گیتوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ٹیگور کی کہانیاں، ناول، ڈرامے دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکے لیکن ان کی شاعری کا ترجمہ نثر میں ہی کیا جاتا رہا ہے۔ اس سے منظوم تا منظوم (مع اصل سُر) ترجمے کی مشکلات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دنوں مہاکوی کے 150ویں سالِ پیدائش کا جشن پورے بنگال میں منایا جا رہا ہے۔ اور ثقافت کی تجارتی پذیرائی کے نئے رجحان کے زیرِ اثر ٹیگور کے فن کو بھی دُور دیشوں میں پہنچایا جا رہا ہے۔

2001 سے وشو بھارتی یونیورسٹی نے ٹیگور کی تحریروں کو کاپی رائٹ کی بندش سے آزاد کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں بیرونی ممالک میں فنِ ٹیگور کی پذیرائی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کوشش میں حکومتِ ہند کی سرپرستی بھی شامل ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی اور دیگر اداروں کی طرف سے پہلی بار فرانسیسی زبان میں ٹیگور کے چھ گیتوں کو رابندر سنگیت میں ڈھالنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ لیکن یہ کام کتنا کٹھن ہے اس کے بارے میں کلکتہ یونیورسٹی کی فرانسیسی زبان کی ٹیچر نوعمر گائکہ مدھو چھندا نے اپنے تجربے سے ایک بات کہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک تو ٹیگور کے عام ترجمے نثر میں ملتے ہیں، دوسرے یہ کہ جب میں ٹیگور کو فرانسیسی میں گاتی ہوں تو مجھے فرانسیسی زبان کے اپنے ہی علم پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اور کہیں کہیں گیت میں اپنی طرف سے زائد الفاظ ڈالنا پڑتے ہیں۔

کنیڈا میں مقیم ایک اسکالر جادُو ساہا نے رابندر ناتھ کے 2500 گیتوں میں سے 100 گیتوں کا انتخاب اپنے انگریزی ترجمہ اور بنگلہ متن کے رومن اسکرپٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ میری بنگلہ زبان سے آشنائی تا حال زبانی نوعیت (Oral type) کی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ سُن کر سمجھ لیتا ہوں، بول لیتا ہوں۔ ہاں جہاں ضرورت در پیش ہو تلاش اور کھوج سے نہیں چوکتا۔ تاوقتیکہ اطمینان نہ ہو جائے۔ میں نے جادُو ساہا کے تراجم اور ٹیگور کے گیتوں کا رومن اسکرپٹ پڑھا۔ دونوں کا موازنہ کیا۔ ترجمے میں خوبصورتی تو ہے لیکن کہیں کہیں قابلِ توجہ تحریف بھی دکھائی دی جو غیر فطری نہیں کہی جا سکتی۔ مترجم کی کوشش بہر حال قابلِ داد ہے۔ حالانکہ انگریزی ترجمے میں ٹیگور کا سُر ناپید ہے۔ ہاں انگریزی کا اپنا میٹر (Metre) اس میں موجود ہے۔ بہر حال شاعری کے ترجمہ میں ایک آنچ تو کیا دو کی بھی کسر رہ جائے تو اسے اکسیر سمجھنے میں کم سے کم مجھے تامل نہیں ہوتا۔

میں نے کوی گرو رابندر ناتھ کے سولہ گیتوں کا اردو میں ترجمہ بہت امنگ، جتن اور محویت سے کیا ہے۔ ان میں سے ۱۳ گیت تو ٹیگور کے بنگلہ شعری نوٹیشن پر کم و بیش منطبق نظر آتے ہیں۔ دو گیتوں (میرا ترتیب نمبر 3 اور نمبر 15) میں سُروں کے تعلق سے قدرے لچک سے کام لینا پڑا۔ اور ایک پریم گیت (ساہا کا ترتیب نمبر 72، میرا ترتیب نمبر 11) میں ہر شعر کے بعد تین چار الفاظ اپنی طرف سے مستزاد رکھ کر ترجمہ کے رِدھم کو مکمل کیا ہے یا یوں سمجھئے کہ اپنے تصور کے مطابق آواز کے خلا کو پُر کیا ہے چنانچہ اس ترجمہ کو رابندر سنگیت کے زمرے میں قیاس نہ کیا جائے۔ مجموعی طور پر رابندر سنگیت کے ان منظوم تراجم میں میں نے کسی معنوی خورد بُرد سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ پہلی بار اہلِ اردو ٹیگور کے کچھ نغمات اصل سُروں کے مماثل اوزان میں پڑھ اور گنگنا پائیں گے۔ ان گیتوں سے الگ اپنے مضمون ''ٹیگور کے گیت'' میں ٹیگور کے کئی گیتوں سے اقتباسات میں نے

نثری ترجمہ میں پیش کیے ہیں۔ مذکورہ مضمون اردو میں ایک نیا اضافہ ہے۔

اب آپ ٹیگور کے سولہ گیتوں کا میرا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ہر ترجمہ کے اوپر اصل گیت کا بنگلہ مکھڑا بھی اردو میں لکھ دیا ہے۔ انگریزی ترجمے کی ابتدائی لائنیں بھی نقل کردی ہیں۔ امید ہے کہ میری مشکل پسندی سے لوگ لطف اندوز ہوں گے۔ جس ترجمے کو کوئی رابندر سنگیت میں شمار کرنے میں متامل ہوا سے صرف ادبی ترجمہ قرار دے سکتا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ حال میں سنگھروں کی مانگ پر کچھ رابندر سنگیت کا ہندی میں ترجمہ ہوا ہے جس میں اصل سُروں کے مطابق شبد تو بیٹھا دئے گئے ہیں لیکن اصل متن کا نغماتی آہنگ اُس میں نہیں پایا جاتا۔ اردو میں اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔

[ف۔س۔اعجاز]

16 رابندر سنگیت

SI. 5

پوجا

(1)

آمی جو کھون تانر دُوارے بِھکشا نیتے جائی
تَو کھون جاھا پائی
شے جے آمی ھا رائی بارے بارے
تینی جوکھون بِھکشا نیتے آشین آمار دُوارے............

When I go to His door for alms, whatever I gain
I lose that again and again.

جب بھی بھکشا لینے جاؤں اُس کے دُوار
جو کچھ اُس سے پاؤں، کھو بیٹھوں ہر بار
مجھ سے لینے بھیک اگر وہ میرے دُوارے آئے
تب کیا کچھ ہو جائے
توڑ کے تالا من کے بھیتر دیکھوں گُپت رتن
جنھیں کبھی نہ کھوئے من
بھور جب اُس کے دُوارے چل کر، اُوشا مانگنے آئے
تب وہ اس دھرتی کے اوپر اُجیارا بکھرائے
سانجھ بھئے جب ہاتھ اُٹھا کر سب کو دے وہ دان
تب ہوتا یہ گیان
اندھیارے میں پھوٹ اٹھتا ہے اُس کے پران کا دھن
اپنے مُکٹ پر پہنے ہوئے ہے اپنے ہی وہ رتن

SI. 9

پوجا

(2)

بِسوا جو کھون نِدرَ مَگون، گگن اندھَکار
کے دے آمار بینار تارے آیمون جھَنوکار............

When the world is in sleep
And the sky is azure deep
Who is that by His soft strumming
Sends my *veena* in such a melody.

دنیا ہو جب مگن نیند میں   اور گگن اندھکار
جانے کون مری بینا کو   دیتا یوں جھنکار

نیند اُڑ جائے آنکھوں سے   چھوڑ بچھونا اُٹھ جاؤں
نیناں جس کا درشن چاہیں   اُس کو دیکھ نہ پاؤں

روح میں کوئی نغمہ جاگے   گونج اُٹھے جب پران
جانے کس کی بانی چھیڑے   بیاکُل سُر ہر آن

من کے اندر جہاں بھی دیکھوں   غم ہی غم ہر سو
بوجھ نہ پاؤں کون ہردے میں   بھر دیتا آنسو

کس کو اَرپن کروں میں سب کچھ   کس کو دوں اُپہار
کس کے گلے میں پہنا ڈالوں   اپنے گلے کا ہار

SI. 11

پوجا

(3)

دُکھیر تیمِرے جودی جُوالے تَبو منگل آلوک
تو بے تائی ھوک

Should in the darkness of my grief
Shine Your light hallowed,
Let it be

اگر میرے غم کے اندھیرے میں ہو جائے مدّھم سا بھی ایک تیرا اُجالا
تو ہو جائے وہ

اگر موت پہنچا دے مجھ کو وہاں تک جہاں تیرا گھر ہے سدا رہنے والا
تو ہو جائے وہ

اگر تیری پوجا کے جلتے دیئے میں کوئی شعلۂ غم کا بھڑک اُٹھے میرا
تو ہو جائے وہ

اگر میری آنسو بھری آنکھوں میں اک محبت بھرا تیرا چمکے اشارا
تو ہو جائے وہ

پوجا Sl. 19

(4)

جے راتے مور دُوارا گُولی بھانگلو جَھوڑے
جانی نہ تو تُمی ایلے آمار گھورے

I didn't know that You came to my shore

When the stormy night broke down my door.

جس رات کو طوفان نے توڑا تھا میرا در
معلوم نہیں تھا کہ تُو آیا تھا مرے گھر
جو کچھ تھا مرے چاروں طرف، ہو گیا کالا
اور بجھ گیا جلتے ہوئے دیپک کا اُجالا
تب ہاتھ بڑھا سوئے فلک کس لئے میرا ؟
اندھیارے میں جیسے ہو کوئی خواب سا دیکھا!
طوفان تری جیت کا اعلان تھا، کیا تھا؟
جب صبح ہوئی تب تو مرے در پہ کھڑا تھا!
گھر تھا مرا خالی، مری ہستی بھی تھی خالی
اُس وقت نظر آئی تری شان نرالی

پوجا Sl. 28

(5)

پے لے چی چُھٹی بِدائے دیھو بھائی ——
سو بارے آمی پر نام کورے جائی

I've got my leave, my friend, bid me adieu

I depart with my salute to all of you.

چھٹی ملی آج بھائی، سب سے بدائی چاہوں
سب کو پرنام کرتا جاؤں
لوٹا دی میں نے دَر کی چابی، گھر یہ نہیں اب میری دابی
سب کی دعائیں لیتا جاؤں

بہت دنوں میں رہا پڑوسی
رہا ہوں جانے یہاں میں کب سے
دیا ہے جتنا آپ کو میں نے
اُس سے زیادہ ملا ہے سب سے
اب رات صبح بننے لگی ہے، کونے کی بتی بجھنے لگی ہے
آئی ہے میرے نام کی پکار، سو میں سب سے جدائی چاہوں

پراکرتی / فطرت Sl. 38

(6)

آج دھانیر کھیتے رَودرو چھایائے لُکو کُربِر کھیلا
رے بھائی لُکو کُربِر کھیلا

In the paddy field today the light and shadow are playing

Hide and seek ,my friend, playing hide and seek!

دھان کے کھیت میں دھوپ اور چھاؤں
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، کھیل ہے آنکھ مچولی کا
نیل گگن میں سادہ ابر کی کشتیاں کس نے تیرا دیں؟
بھائی مرے یہ کھیل ہے آنکھ مچولی کا
مدھومکھیاں مدھو چوسنا بھول گئی ہیں آج
دھوپ بھرے آکاش تلے مستی میں اڑتی پھرتی ہیں
ندی میں تیریں بطخیں گال سے گال ملا کر
کھیل ہے آنکھ مچولی کا، بھئی کھیل ہے آنکھ مچولی کا

گھر نہیں جانا ہے ہم کو، گھر نہیں جانا ہم کو آج
آج آکاش کو توڑ کے اُس کا سارا خزانہ لوٹیں گے
کھیل ہے آنکھ مچولی کا، بھئی کھیل ہے آنکھ مچولی کا
جیسے جُوار کے جل پر تیریں ختم نہ ہوتے جھاگ
یونہی ہوا کے ساتھ فضا میں بکھرا ہنسی کا راگ
کوئی کام کئے بن سارا دن کاٹیں گے آج
کچھ نہیں کرنا آج ہمیں، ہم بنسی بجائیں گے آج
کھیل ہے آنکھ مچولی کا

پراکرتی

Sl.54

(7)

جو دی تا رے نائی چینی، گو، شے کی آمائے نیبے چینی
ایئی نَبو پھالگُنیر دِنے —— جانی نے، جانی نے

If I can't sight her will she spot me so,

In this new *Phalgun* day? I do not know,

I do not know

میں نہ پہچانوں اُسے تو کیا وہ پہچانے گی مجھ کو؟
اِس نئے پھاگن کے دن —— جانوں نہ، جانوں نہ

کیا میرے کانوں میں وہ گا گا کے بولے گی
کیا نئے پھاگن کے دن جان میری لے لے گی
جانوں نہ، جانوں نہ.......... [میں تو جانوں نا] ★

کیا وہ اپنے رنگ میں پھولوں کو رنگ لے گی
کیا سوئی کلیوں کی آ کر نیند لُوٹے گی
جانوں نہ، جانوں نہ.......... [میں تو جانوں نا] ★
تازہ نئے پتوں کو کیا ہلا دے گی وہ
من کی چھپی باتوں کو کیا جان جائے گی وہ
اِس نئے پھاگن کے دن میں تو جانوں نہ
جانوں نہ، جانوں نہ.......... [میں تو جانوں نا] ★

★ مترجم کا صوتی اضافہ

پراکرتی

Sl. 56

(8)

مدّھیہ دِنے جابے گان بو ندھو کورے پاکھی
ھے راکھال، بینُو تَبو باجاؤ ایکاکی

When at mid day the birds stop singing

O herdsman, alone your flute keeps playing.

دوپہری میں پنچھی گیت نہیں گاتے جب
چرواہے بس تیری بنسی بجتی ہے تب

میٹھے سپنے میں کھویا تُو، مگن دھیان میں آنکھیں
جنگل کے اُس دُور چھور پر، دھوپ سُنے ہے تانیں
چرواہے بس تیری بنسی بجتی ہے تب
جب آکاش میں بھر جاتی ہے گرم سانس اور پیاس
ڈمرو بجتا، تپتے گگن پر کر لیتا سُر باس
بڑھتی اُمس چڑھتی گرمی، گمبھیر ہو جاتی دھرتی
بجلی چمکتی، دیتی خبر بیساکھ کے طوفاں کی
چرواہے بس تیری بنسی بجتی ہے تب

پراکرتی

Sl.64

(9)

جے تے دَو جے تے دَو گے لا جارا
تُمی جے یو نا، تُمی جے یو نا

Those who have left, let them go

Please don't you go,

Don't you go also

My songs of rain are not yet over though.

جانے دو، جانے دو، جو جائے یارا
تم نہیں جانا،
تم بھی نہ جانا
میرا ساون گیت ہُوا نہیں ہے سارا
کٹیا کٹیا بند دُوار رات اکیلی اندھکار
جنگل کانپے اُس کنارے اور ہوا بے چین یار

دیپ ہے بجھا، بجھا رکھو ہاتھ سے ہاتھ چھُوا رکھو
کنگن بجیں ہاتھوں کے تال سے تال مِلا رکھو

جس طرح بے چین ہو ندی کنارا پانی میں مل جائے جیسے پانی سارا
جھر جھر جھرتی جائے جیسے ساون کی دھارا

سوادیش / مادرِوطن

Sl.66

(10)

جودی تور ڈاک شُنے کیئو نا آشے تو بے ایکلا چو لو رے
ایکلا چو لو، ایکلا چو لو، ایکلا چو لو، ایکلا چو لو رے

If no one answers your call walk alone,

Walk alone, walk alone and walk alone,

تیری آواز پر جو کوئی نہ آئے تُو تُو تنہا چل بھئی
تنہا چل، تنہا چل، تنہا چل، تنہا چل بھئی

کوئی گر بات نہ کرے، ارے ارے او ابھاگے
ہر کوئی منہ پھرا لے، ہر کوئی کرے بھئے
ایسے میں پران کھول
ارے منہ کھول، تیرے من میں جو ہے تنہا بول بھئی

اگر سب ہی چلے جائیں، ارے ارے او ابھاگے
اگر پتھریلی راہ میں کوئی لوٹ کر نہ آنا چاہے
تو پھر راستے کے کانٹوں میں
ارے خون لگے پانوؤں پر خود ہی تنہا ڈول بھئی

یہاں گر روشنی نہ ہو، ارے ارے او ابھاگے
اگر طوفاں کی رات میں تجھے بند ملیں دوار سارے
اور یہاں بجلی گرے
تُو تُو سینے کو روشن کر لے، اپنی راہ تنہا ٹٹول بھئی

SI.72 **پریم**

(11)

آمار پران جا هاچائے تُمی، تائی تُمی تائی گو
تُما چھاڑا آر لے جَگتے مور کیها نائی کِچھو نائی گو

What is my heart's desire
That you are, yes you are.
You're the world to me,
Nothing none else I see.

میرا دل جو چاہے، وہ تم | وہی تم ہو، ہاں وہ ہو تم | بس اِک تمہیں*
سوا اِک تمہارے اپنا | سارے جگت میں میرا | کوئی نہیں
سُکھ جو نہیں پاؤ تو | سُکھ ڈھونڈنے تم نکلو | جاؤ کہیں
تم میرے من میں ہو تو | کچھ نہ چاہوں گا میں سُن لو | کچھ بھی نہیں
تم سے جُدا میں رہ کر | رہوں گا تمہارے اندر | کر لو یقیں
لمبی راتیں، دن ہیں لمبے | لمبے لمبے سال مہینے | لمبی زمیں
کسی اور کو چاہو تو | لوٹ کر نہیں آؤ تو | میں تو ہوں یہیں
میری دعا تو یہ ہے | جسے چاہو وہ مل جائے | تمہیں اے حسیں
میرے حصے میں آ جائے | جتنا دُکھ بھی دنیا میں ہے | میرے ہم نشیں

★ یہ مُستزاد مترجم کا صوتی اضافہ ہے اور اس ترجمے کو رابندر سنگیت کے زمرے میں قیاس نہ کیا جائے۔

SI.73 **پریم**

(12)

آمی چینی گو چینی تُو مارے او گو بد یشنی
تُمی تھاکو سِندھو پارے او گو بد یشنی

I know you,I know you,O lady from distant land!
You live beyond the sea,O lady from distant land.

میں جانوں، جانوں، جانوں تجھے اے بدیشنی
رہتی ندی کے پار تُو ہے اے بدیشنی

تجھے صبح میں نے دیکھا جب رُت خزاں کی تھی
تجھے دیکھا میں نے شب میں، تھی وہ رات مدھ بھری
تجھے دیکھا من میں اپنے میں نے اے بدیشنی

تُو نے جو بھی گنگنائے، تو نے جو بھی گائے گیت
میں نے آسماں سے کان لگا کر سُنے وہ میت
میں نے سونپ دی ہے جان تجھے اے بدیشنی

ساری زمیں گھوم لی، تب آیا ہوں یہاں
میرے لئے یہ دیش نیا، ہے نیا جہاں
مہمان تیرے دُوار پہ ہے اے بدیشنی

SI. 74 **پریم**

(13)

آمی هِردوئر کوتھا بولتے بیاکُل، سُدھائی لا نا کیها
شَے تو ایلو نا جارے سو نپلَم ایئی پران من دیها

I ached to tell all that's in my heart.
None asked at all.

ہم دل کی باتیں کہنے کو بے چین، کسی نے نا پوچھا
وہ تو آیا نہیں، جاں تن من جس کو سب سونپ دیا
کیا وہ ہم کو راہ میں ڈھونڈے؟ کیا گیت بِرہ کے گائے؟
ہم جس کی بانسری سن کر، گھر اپنا چھوڑ نکل آئے

Sl.81

پریم

(14)

دِیے گیِنُو بسنتیر ایٹی گان کھانی
بَرَس پُھوڑائے جابے، بُھولے جابے جانی

This song of spring I am offering,

The year will end, You'll be forgetting.

اِک گیت بسنت کا دے کے چلا
برس کٹے گا، تُو بھول جائے گا

یہ جو شام آئی ہے پھاگن کی
تری آنکھ ایسے میں چمک اٹھی

مِرے گیت کے درد کو تُو سمجھا
تو یہ مجھ پر تیرا کرم ہوا

جب وقت آئے گا لوٹنے کا
یہاں اور نہیں میں ٹھہرنے کا

جب کھیل انجام کو پہنچے گا
دل تجھ سے اجازت چاہے گا

تب ایک نیا میت آئے گا
نیا پھاگن گیت سنائے گا

Sl.86

پریم

(15)

کاندالے تُمی مورے بھالو باشاری گھائے
نِبیڑ بیدوناتے پُلوک لاگے گائے

You make me cry with tenderness,

Even in deep pain I feel happiness.

تو نے ایسی اُلفت جتائی مجھ کو رُلا دیا

میرا غم گہرا، پر خوشی لگے
تیری اُلفت مجھ کو بھلی لگے
تیری چاہت کے سنگ دُور دیس میں جا پہنچوں
میرے پاؤں چاہے دُکھ جائیں
بجے میرے من میں بانسری
بہے نینوں سے دھارا نیر کی
اِس دکھ میں بے حد مٹھاس ہے، میرا سب کچھ تیرے پاس ہے
تو نے سب کچھ میرا چھین لیا، اب کچھ بھی کہاں میرے پاس ہے
میں پوری طرح تیرے بس میں ہوں
یہ کیسے پیش و پس میں ہوں
آزاد نہ ہونا چاہے من، یہ جانے کیسا یہ بندھن
تو نے کس بندھن میں باندھ لیا!۔

Sl.94

پریم

(16)

تُمی کون کاننیر پھول، کون گُگنیر تارا
تُمائے کوتھائے دیکھے چی جے ناکون سو پنیر پارا

A flower from some garden you are or a sky's star

Seem to have seen you in some dream afar.

کس باغ کا ہو پھول، کس گگن کا تارہ؟
تمہیں دیکھا ہے کہاں، کس خواب کا نظارہ؟

کب گایا تھا تم نے
میری صورت تکتے
نینوں سے نیناں ملا کے
بھول گیا، مجھے یاد نہیں
بس من میں ہے جاگا
اُن آنکھوں کا تارہ

تم بات نہ کرنا
ایک جھلک میری دیکھو اور چلی جاؤ
یہاں اب نہ ٹھہرنا
اِس چاندنی رُت میں ہنسو اور چلی جاؤ
میں نیند بھری آنکھوں سے تاکوں
چاند کا چہرہ
تری آنکھوں کے دو تارے
ڈھال دیں مجھ پر
کرن کی دھارا ●●

پیرزادہ قاسم
98/3/1, 8th Lane,
Khayaban-e-Rahat
Phase VII, Dha
Karachi, Pakistan

نظم

ابھی تک ہم نہیں بولے

ابھی تو آپ ہیں
اور آپ کا زورِ خطابت ہے
بہت الفاظ ہیں نادر
بہت بے ساختہ جملے
ابھی تو لب کشائی آپ کی
اپنی گواہی ہے
ابھی تو آپ ہیں ظلِ الٰہی
آپ ہی کی بادشاہی ہے
ابھی تو علم و حکمت
لفظ و گوہر آپ ہی کے ہیں
ابھی سب فیصلے
سب مہر و محضر آپ ہی کے ہیں
ابھی سب زر، جواہر، مال و دولت
آپ ہی کے ہیں
ابھی سب شہرت و اسبابِ شہرت
آپ ہی کے ہیں
ابھی کیا ہے
ابھی تو آپ کا جبروت
لہجے میں عیاں ہوگا
ابھی تو آپ ہی کے نطق و لب سے
آپ کا قصہ بیاں ہوگا
ابھی تو محترم بس آپ ہیں
خود اپنی نظروں میں
معظم، محتشم القاب ہیں
خود اپنی نظروں میں
ابھی تو گونجتے اونچے سروں میں
آپ ہی ہیں مدح خواں اپنے
سبھی لطف و کرم گھر کے
مکاں و لامکاں اپنے
ابھی تو آپ ہی کہتے ہیں
کتنا خوب کہتے ہیں
جو دل میں آئے کہتے ہیں
جو ہو مطلوب کہتے ہیں
مگر جب آپ کی سیرت پہ
ساری گفتگو ہولے
تو یہ بھی یاد رکھئے گا
ابھی تک ہم نہیں بولے۔

غزل

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بُجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بُجھا ہوا

محفلِ رنگ و نور کی پھر مجھے یاد آ گئی
پھر مجھے یاد آ گیا ایک دیا بجھا ہوا

مجھ کو نشاط سے فزوں رسمِ وفا عزیز ہے
میرا رفیقِ شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بُجھا ہوا

سب مری روشنئ جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بُجھا ہوا

بی۔ ایس۔ جین جوہر
B-7, Industrial Estate Partapur,
Delhi Road, Merut - 250103
(M) 9358400900

قطعہ

چھوتی ہے ہر دماغ کو امید کی شعاع
ہوتا ہے اور ذہن میں یادوں کا اجتماع
ہر سال، کچھ لکیریں سی چہرے پہ چھوڑ کر
جاتے ہوئے ہر ایک کو کہتا ہے 'الوداع'

خودنوشت (دوسری قسط)

ثروت نامہ

ثروت خان
76,O.T.C
Sherton Hotel Road,
Malla Talai,
Udaipur-313001 (Raj)

اس کے تخلیقی سفر کی بھی عجیب داستان ہے۔

ہوا یوں کہ افغانستان کے بُنیر علاقے سے مغلوں کے دور میں سنبھل (یو۔ پی) میں آکر مقیم ہوئے۔ سالارزئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے خاندان کی اس فرد کا اردو ادبی دنیا کے معاصرین سے تعارف بھی ہوا تو A.S.C علی گڑھ میں۔ 1992ء کا ذکر ہے۔ 23 دن کا یہ قیام اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ فکشن پر ہونے والے اس ریفریشر کورس میں ملک کے کم وبیش سبھی اہم فکشن نگاروں سے لکچر دلوائے گئے۔ خود کو آرڈی نیٹرس بھی معتبر افسانہ نگار تھے۔ وہ صبح شام دن، دوپہر ہر وقت ملک کے کونے کونے سے آئے 51 لکچررس کو لکھنے پڑھنے کی تاکید کیا کرتے۔ ان کے ہمراہ ناول نگار غضنفر بھی ہوتے۔ دونوں پکے دوست۔ آتے جاتے یہی کہتے۔ کوآرڈی نیٹر طارق چھتاری کا لہجہ تو بے حد نرم، شیریں اور مہذب قسم کا ہوتا۔ بے حد متوازن شخصیت کے اس مالک کو بھی شرکاء دل سے پسند کرتے۔ یہ بھی آتی۔ لیکن یہ سوچتی۔ ہم پڑھ تو سکتے ہیں لیکن لکھنے کا کام۔؟ یہ کیسے کیا جاتا ہے بھلا؟؟'' کیونکہ مدرس تو اکثر نصابی مواد پر ہی اکتفا کیے رہتا ہے۔ نوکری، چھوکری، گاڑی، بنگلہ۔ اب وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں کہ اپنی اس حسین دنیا میں کتابوں کی بو، کے ساتھ ساتھ دیمکوں کی دعوت کا انتظام کیا کرے۔ پھر Female کی تو ذمہ داریاں ان گنت ہوتی ہیں۔ بچے، خاندان، پاندان وغیرہ۔ سبھی کو تو دیکھنا ہوتا ہے بھلا۔ پھر نگوڑی یہ موٹی تنخواہ اسمارٹ بازار کا رخ کروا دیتی ہے۔ ایسے میں لکھنے لکھانے کے لیے نہ ہی وقت بچتا ہے نہ ذہن۔ غرض ہمارے کوآرڈی نیٹر طارق چھتاری صاحب کی بات آئی گئی ہو جاتی۔ بالکل U.P. کی بجلی کی طرح۔ آئی اور گئی۔ آئی گئی۔

لیکن یہ بھی ہوتا کہ ہر Resource Person کا تعارف ان کی شائع شدہ کتب کے حوالے سے کروایا جاتا تھا۔ ''ان کا یہ ناول ہے، ان کا فلاں مجموعہ۔ اتنی کتابیں، اتنا کام''۔

اُف۔۔ !! حیرت صد حیرت۔ ہم جیسے تو Ph.D کر کے اپنے آپ کو طرم خاں سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہ !!!۔ جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، اس تعارف نے اس خاتون کو۔ یہی نہیں، سرسید کی کاوشوں کو دیکھ کر تو عقل حیران تھی ہی، عبداللہ کالج کے پاپا میاں، بی اماں کی آدم قد تصویروں سے جھانکتی ان کی شفقت، ان کی دعوت، ان کی فراست، ان کی عزیمت اور ان کی تعب کے ساتھ ساتھ وہاں کے در و دیواروں سے بھی گونجتی رشید جہاں اور عصمت کی پکار نے ایسی دعوت فکر عطا کی کہ اس خاتون کے تخیل کو نئی راہیں ملیں، اور رہی سہی کسر سلطان جہاں بیگم نے پوری کر دی۔ اسے لگا یہی وہ دنیا، وہ آسمان، وہ چاند ستارے ہیں۔ جن کے لیے شائد یہ سرگرداں تو تھی لیکن اس سرگردانی سے لاعلم بھی تھی۔ آشنائی کہاں تھی، اس فکر سے۔ کامیاب لوگوں کی کامیاب شبیہ کو من میں بسائے ان 23 دنوں کی وہ 23 راتیں اور ان کا عالم۔ کچھ نہ پوچھیے۔ بس کورے کاغذ پر انگلیوں میں تھا قلم کچھ اس طرح حرکت میں آیا کہ گویا علی گڑھ کے ادبی ماحول نے اس پر تخلیقی صور، پھونک دیا ہو۔ اور ''سمرپن'' نام کی پہلی کہانی نے اس کاغذ کو رنگ دیا۔ عرصہ بعد یہ کہانی جب ''تخلیق'' لاہور میں چھپی تو جوگندر پال صاحب کا خط آیا:

''آپ کی ایک چھوٹی سی کہانی ''سمرپن'' (مطبوعہ تخلیق فروری 2007) اس لیے اتنی اثر آگیں ہے کہ آپ نے بجا طور پر اس کی فکری سمتوں کو وقوع میں سمو کر نتائج تک پہنچنے کا ایڈوینچر قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ جیسے کہ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا'' آپ کو بہت دور پہنچنا ہے''۔ اس طویل سفر کے لیے خدا آپ کی ہمت بنائے رکھے۔ دعائیں''۔

بہر حال علی گڑھ سے ڈھیروں سپنے سنجوئے، لاتعداد حوصلوں کی حرارت سے سرشار، دعوتِ فکر کی آنچ میں تپتی ہوئی یہ خاتون جب اپنی کرم بھومی اودے پور آئی تو بہت جلد بارہ پندرہ افسانے ہو گئے۔ پھر اچانک ایک روز شاہد عزیز، جو اس وقت راجستھان میں اردو اکادمی کے ممبر بھی تھے، آئے۔ کہا'' شاعرات کا کل ہند مشاعرہ کروانا ہے۔ آپ کرا دو''۔ اس نے کہا'' ہو جائے گا''۔ اور کروا بھی دیا۔ اکادمی کے سکریٹری معظم علی سے فون ہی فون پر اہتمام سے متعلق باتیں ہوتیں۔ حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے انجان تھے۔ شاہد عزیز سے انہوں نے کہا بھی تھا۔ ''عید کے چار دن پہلے مشاعرہ ہے اور پانچویں دن ہولی۔ کیسے کیا ہوگا ؟ ایک ایسی خاتون کو آپ نے ذمہ داری دے دی ہے جسے کوئی نہیں جانتا''۔ ''میں جانتا ہوں''۔ شاہد عزیز نے زور دے کر کہا۔ مشاعرہ بیحد کامیاب رہا۔ ساجدہ زیدی اور داراب بانو کو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ بس اس کے تیسرے دن اسی اکیڈمی نے جودھپور میں سمینار کیا۔ اس کی بھی شرکت رہی۔ لیکن صرف سامع کی حیثیت سے۔ قمر رئیس اور شمس الرحمٰن فاروقی کو چھوڑ کر تقریباً سبھی نقاد موجود تھے۔ سب کو دیکھا، سنا۔ لیکن مباحث میں بالکل حصہ نہیں لیا۔ بس بیٹھ کر ٹکر ٹکر دیکھا کیے۔ اور سمجھنے کی بھرپور کوشش بھی کی۔ وارث علوی کو سنا۔ نارنگ صاحب کو دیکھا۔ سید محمد عقیل، سیدہ جعفر، مغنی تبسم، علی احمد فاطمی، ڈاکٹر صادق، عتیق اللہ، شافع قدوائی اور بعد کے دیگر۔ دن، سمیناروں کی سنجیدہ گفتگو میں گزرتا اور شام کو ایک کرسی پر وارث علوی بیٹھ جاتے، ان کے قدموں میں شرکاء جن میں خواتین بھی ہوتیں، اسکالر بھی ہوتے۔ وہ بولتے رہتے۔ یہ انہاک سے سنتے رہتے۔ اس خاتون کو تو وارث صاحب کے وجود سے ہی ڈر لگتا تھا۔ اتنے جید، اتنے عالم۔ کتنی کتابوں کے مصنف۔ ایک سے بھاری دوسری۔ فکشن کا انسائیکلوپیڈیا۔ باپ رے باپ۔ نہ جانے کیا پوچھ بیٹھیں؟''۔ چنانچہ یہ تو دور ہی رہی ان سے۔ بس سکریٹری ایک کام سونپا تھا اسے۔ مسز نارنگ کو کمپنی دینا۔ دوسرے دن لے گئی تھی انہیں یہ راجستھان کی بندھیج کی ساڑیاں خریدوانے اپنے ہمراہ۔ جودھپور کی

ثروت بلڈ ڈونیشن کیمپ میں۔

ایک کاؤن کیمپ کے دوران کالج کی لڑکیوں کے ساتھ۔

افسانہ نگار رتن سنگھ اور صحافی سعادت نواب کے ساتھ غالب اکاڈمی دہلی میں۔

لٹریسی کی مہم میں گاؤں کے گھر گھر جانا پڑا۔

ثروت کے پہلے مجموعہ "ذرّوں کی حرارت" کا اجرا (2004)۔ پروفیسر وارث علوی کے ساتھ۔

غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں۔ دائیں سے ابن کنول، اقبال مرزا (لندن)، سید محمد عقیل رضوی، علی احمد فاطمی۔

دہلی۔ 10/3/4۔ پدم بھوشن کا خطاب ملنے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دیے گئے ایک استقبالیہ کی تصویر۔

غالب اکاڈمی، دہلی میں قرۃ العین حیدر کے ساتھ

ڈاکٹر محمد حسن کی ادبی خدمات پر یک روزہ سیمینار دہلی میں۔ بائیں طرف بیگم محمد حسن۔ دائیں طرف ڈاکٹر تنظیم۔

تقریباً تمام بڑی دکانیں چھان ماری تھیں۔ دوپہر بھر پھرنے کے بعد جب یہ دونوں ہوٹل آئیں تو اس کا مارے سردرد کے برا حال تھا۔ مسز نارنگ اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بٹھایا۔ بڑی شفقت سے پانی کا گلاس تھمایا۔ نارنگ صاحب قیلولہ کے لیے دراز تھے۔ فوراً سمٹ بیٹھے۔ بیوی نے ان سے سردرد کی گولی کے لیے پوچھا اور بنا جواب کا انتظار کیے الماری میں تلاشنے لگیں۔ نارنگ صاحب نے نہ جانے کہاں سے گولی نکال کر اس خاتون کی طرف بڑھاتے ہوئے بے حد خلوص سے کہا ''اسے لے لیں، جلد اثر کرے گی''۔

اردو کی کسی بڑی ہستی سے یہ تھی اس کی پہلی ملاقات۔ یہ غالباً 2001ء کی بات ہے۔ اس سمینار میں ابوالکلام قاسمی کو اس نے اپنے چھ سات افسانے پڑھنے کے لیے دیے۔ انہوں نے ناشتے پر کہا ''زبان اچھی ہے لیکن رومان اور جمالیات زیادہ ہے، حقیقت سے رشتہ جوڑو''۔ اللہ جانے جھوٹ کہا تھا یا سچ۔ دل سے کہا تھا یا اوپری۔ بہرحال جو کہا۔ اس پر اس خاتون نے سنجیدگی سے عمل کیا اور پھر پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ معظم علی سے اب دوستی ہوگئی تھی۔ انہوں نے ہی اس کا تعارف ان سب سے کروایا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ابھی کسی بھی طرح کے تعارف کے قابل نہیں تھی۔ پھر ڈھیرے ڈھیرے افسانے شائع ہونے لگے۔ نیا سفر، نخلستان، محفل صنم۔ کی ادبی محفل میں اسے بھی جگہ ملنے لگی۔ پہلا افسانہ 2001ء میں نخلستان میں شائع ہوا تو اس نے رسالہ کو ہی چوم لیا تھا۔ مگر چپکے سے۔ پھر تو شاعر، آج کل، ایوان اردو وغیرہ میں بھی شرکت ہونے لگی۔ تو محسوس ہوا کہ گاڑی ٹریک پر آتی جارہی ہے۔ اسی دوران سمیناروں میں بھی آنا جانا ہوا۔ یہاں اقبال مجید، رتن سنگھ، جوگندر پال، کمال احمد صدیقی، عابد سہیل، قمر رئیس اور سید محمد عقیل جیسے ادبی جیدوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کی شفقت کے ساتھ ان کی رہنمائی اور ان کی عالمانہ نصیحتیں اس کے لیے نعیم ثابت ہوئیں۔ سب کے سب معتبر، متبحر۔ یہی نہیں۔ ان کے بعد کی نسل اور اس کے سینئرس نے بھی اسے بہت حوصلہ بخشا۔ وہ سب Resource Persons جنہیں Refresher کے دوران علی گڑھ میں سنا تھا، ان سب کے بنا یہ داستان ادھوری ہے کیونکہ ان سب کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا رہا اور اس نے ان سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔

یاد آرہا ہے کہ سب سے پہلا نیشنل سمینار اس نے غضنفر کی دعوت پر الہ آباد میں پڑھا تھا۔ غضنفر مائک تھامتے ہیں تو بے حد سنجیدہ ہوجایا کرتے ہیں۔ اسے ان کی یہ سنجیدگی ہمیشہ متاثر کرتی رہی ہے۔ علی گڑھ میں غضنفر نے جب UPSC کا نصاب تیار کروانے کے لیے ورک شاپ کیا تو اسے بھی بلایا۔ ایک شام۔ ممتا کالیہ کو کہانی پڑھنی تھی۔ غضنفر، علی احمد فاطمی اور اجمل اجملی صاحب وغیرہ نے اس کی کہانی بھی رکھ دی۔ یہ ڈری تو خوب حوصلہ افزائی بھی کی۔ خیر قاضی عبدالستار صاحب کی صدارت ہوئی اور پروفیسر شہریار صاحب مہمان خصوصی تھے۔ اس نے ہانپتے کانپتے اور بظاہر اسمارٹ بننے کی شعوری کوشش کرتے Pindrop Silence میں کہانی پڑھی۔ صدر محترم کو کہانی بیحد پسند آئی۔ زبان کی بھی خوب تعریف کی انہوں نے۔ سب نے کہا ''زبان کی سند ہے یہ''۔ مبارکبادیں دی گئیں۔ علی گڑھ میں واقعی اہل نظر، اہل علم و دانش کا مجمع تھا یہ۔ اس کی زندگی کا یادگار اور سنہرا دن۔ اس شام گھر جاتے ہوئے غضنفر صاحب نے ایک جملہ کہا تھا اس سے ''بھرم رکھنا ہم سب کا''۔ اس جملے میں پوشیدہ نصیحت، عزت، تاکید، امکان اور وہ بہت کچھ جو یہ محسوس کرتی ہے۔ نے، قلم کو ایسے مضبوطی سے تھامنے کی قوت عطا کی کہ اس نے اسی دن سے اپنے دل میں ڈھیرے سے عزم کیا کہ مجھے اپنے آپ کو ان دانشوروں کے پاس بیٹھنے کے قابل بنانا چاہئے۔ یہ قابل ہوئی یا نہیں ہوئی۔ بات دیگر ہے۔ لیکن اس کے ان تمام سینئرس نے قدم قدم پر حوصلہ بخشا۔

ایسے ہی ایک مرتبہ دہلی میں ایک سمینار کی شام سب اکٹھئے ہوئے۔ یہ نئی نئی تھی۔ چنانچہ نگار عظیم کے دامن میں دُبکی بیٹھی تھی۔ بات چلی تو ہوتے ہوتے اس کے ذکر تک آپہنچی۔ ذکر ہوتا ہی رہا تو نگار عظیم نے اس کی طرف اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے لبوں کے شیریں تبسم کے ساتھ نظر ڈالتے ہوئے کہا ''دیکھئے آپ کو ہم نے کیسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گود بنا کر اس طرح اشارہ کیا جیسے کوئی ماں اپنے ننھے کو احتیاط سے تھامتی ہے کہ کہیں وہ چھوٹ نہ جائے، کہیں اُسے چوٹ نہ لگ جائے، اور پھر اُن کے ساتھ بھی Seniors کی نظروں کا جو ردِّعمل ہوا ہوگا، اُس کا اندازہ لگا کر ہر کوئی محظوظ ہوسکتا ہے۔ اسے محسوس ہوا تھا، واقعی یہ سب اپنے ہیں، بڑے ہیں، فنکار ہیں۔ دل بڑا۔ باتیں بڑی۔ وژن بڑا۔ اور اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ ایک ریشم کی ڈوری ہے جو اس کے قلم کو اُن سب کے قلم سے باندھ کر تخلیقی سفر کے کارواں میں ساتھ چلنے کے لئے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اور یہ تو پھر ایسی کھنچی کہ اپنے قلمی رشتے کا حق ادا کرنے میں عمر کے باقی حصّہ کو ادب کے لئے وقف کرتی چلی گئی۔ اور چلی جارہی ہے۔

ایسی ہی ایک ادبی شام تھی۔ اقبال مجید، علی احمد فاطمی اور پیغام آفاقی بے حد فرحت بخش مقام پر کسی ڈنر میں محوِ گفتگو تھے۔ ادب کے متعلق بڑے کام کی باتیں ہُو رہی تھیں۔ ویسے سمینار کے بعد ہی کام کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ بھی تھی سُنتی رہی۔ انہاک سے۔ بس اُن دنوں اس کا کام سُننے اور سمجھنے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ بھلا یہ بولتی بھی کیا۔ لیکن یہی سُننا اور سمجھنا اس کے تخلیقی عمل کا حصّہ بنتا چلا گیا۔ اس حصّہ میں ایک اہم رول علی احمد فاطمی کا بھی رہا۔ اُن کی ترقی پسند فکر اور اردو ادب سے گہری وابستگی کے سبب ذہنی مناسبت اور فکری سطح پر ہم آہنگی رہی۔ ہمارے درمیان کبھی بھی کسی بھی آئیڈیولوجی کو لے کر بحث ہوتی، عصری ادب پر تبادلہ خیال ہوتا، افسانہ کی تکنیک، ناول کے فن، اس کی وسعت پر بات ہوتی، ترقی پسند شاعری پر لگے الزامات کے متعلق گفتگو ہوتی۔ سمیناروں کے مقالات پر بات ہوتی۔ یہی نہیں ادبی محفلوں کے ادب و آداب، اُن کا رکھ رکھاؤ، ان کے انتظامات بھی کچھ ہماری بات چیت میں شامل رہتا۔ مطالعہ کی تاکید فاطمی صاحب بھی بہت کرتے تھے۔ یہ پڑھو، وہ پڑھو۔ بہت سی کتابیں بھیجی ہیں اس کو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے کہ ''پڑھنے سے زیادہ سوچو''۔ یہ بات واقعی کمال کی ہے۔ سوچنے سے سچ مچ دماغ کی Dead پڑی Cells بھی حرکت میں آجاتی ہیں۔ ایک مرتبہ کسی بلڈنگ کا زینہ چڑھتے ہوئے آگے آگے تھے۔ جب یہ تھک کر کافی پیچھے رہ گئی تو کہنے لگے ''ہمت سے آگے بڑھو، ابھی ایسی کئی سیڑھیاں تمھیں چڑھنی ہیں''۔ پلّو سے باندھ لی تھی اس نے یہ بات۔ بہت عزت کرتی ہے یہ اُن کی۔ اسی طرح ایک مرتبہ شامِ افسانہ کے موقع پر رتن سنگھ نے بے حد مشفقانہ انداز میں سمجھایا تھا۔ ''ثروت، راجستھان رنگ رنگیلا ہے۔ دیہات تک رسائی کرو، بہت کچھ ملے گا''۔ یہ بات بھی گویا موبائل میں فیڈ کرلی تھی اِس نے۔ پندرہ برس تک مسلسل گاؤں اور کچّی بستیوں میں بطور NSS Programme Officer کے کام کیا ہے اس نے۔ بس اسی تجربے کے تانے بانے کے ساتھ اُن کے جملے قلب و ذہن میں تحلیل ہوکر خارجیت و داخلیت کی

پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے کہانیوں میں سماتے چلے گئے۔ اب اِس کے پاس تقریباً پندرہ سولہ کہانیاں ہوگئی تھیں۔ اُدھر راجستھان اردو اکادی نے مجموعہ شائع کرنے کی پیشکش کی۔ دل بلیّوں اُچھلا بھی لیکن احتیاط ضروری تھی۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے دس ۱۰ کہانیاں اقبال مجید کو ارسال کردیں۔ انھوں نے سفاکانہ رائے دی۔ "ثروت سب کو پھاڑ دو اور دو برس تک فکشن کے عالمی ہیروز کو پڑھو اور پھر دوبارہ اِنھیں لکھو"۔ باپ رے باپ، اتنے سخت جُملے۔ اِس نے ڈہی گھسیا پٹا جملہ دہرایا۔ "ماں سے کہہ رہے ہیں کہ بچوں کا گلا۔۔۔"۔

انھوں نے جملہ مکمل ہونے نہیں دیا اور زور دے کر کہا۔ "بے شک لولے لنگڑے بچے پیدا ہونے سے اچھا ہے، اُن کا گلا دبا کر ختم کردیا جائے"۔ اچھا صاحب! اِس نے بات مان لی۔ ویسے یہ اچھی باتیں جلد مان لیتی ہے۔

اس ضمن میں قمر رئیس کا ذکر ذہن میں بار بار آرہا ہے۔ یہ سچ بھی ہے۔ آنا لازمی ہے۔ کیونکہ اِس کے تخلیقی سفر کا وہ مکمل ایک باب ہیں۔ بہت کچھ سیکھا ہے اُن سے۔ وہ صحیح معنوں میں رہنما ہیں۔ شریر، شفیق، معتبر اور متبحر۔ شیلونگ سے واپسی میں ایک ہوائی سفر کے دوران دو گھنٹے اُن سے ادبی گفتگو رہی۔ جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ Ph.D. میں وہ اِس کے ایکسپرٹ رہے ہیں، چنانچہ بات چھوٹی منظوم ڈراموں سے۔ یونانی سنسکرت اور پھر اردو ڈراموں کی۔ ترقی پسند تحریک سے اُن کی گہری وابستگی کی۔ مارکسزم نے نکات اور نظریے کے متعلق معلومات میں اضافہ کیا۔ پھر عصری ادب میں عصری حِسیت کے بارے میں دیر تک گفتگو رہی۔ اس کے برابر میں بیٹھی نگار عظیم ان دونوں کی باتوں میں کبھی دلچسپی لینے لگتیں اور کبھی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگتیں۔ اس طرح جب بھی یہ دہلی گئی قمر رئیس کے دسترخوان کے لذیذ پکوانوں کا لطف اٹھایا۔ آنٹی بے حد شفیق، محبت وخلوص کی مورتی نظر آئیں۔ اُن کے ہاتھ کا بنا کھانا اور پھر قمر رئیس کی خوش گوئی اور زندہ دلی۔ بس یہ سمجھو کہ مہمان نوازی کی شان نظر آتی تھی۔ جو خالص پٹھانوں کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں ہی خود ڈرائیو کرکے گھر لے گئے دعوت کے لئے۔ ہمراہ عقیل صاحب، فاطمی صاحب بھی تھے۔ لیکن اِسے حیرت تھی کہ اتنے بڑے ادیب، نقاد اور جانے کیا کیا۔ اور یہ خود......! کہیں کوئی Combination نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن صاحب نووارد ہونے کے باوجود ایسے یاد نہیں کہ کبھی کوئی فرق کیا ہو۔ ہر وقت کام، کام اور بس کام۔ اس کا خیال، اُس کا نظریہ، یہ کتاب وہ رسالہ۔ یہ سیمینار وہ اہتمام۔ تھکنے یا رُکنے کا نام ونشان نہیں۔ اُن کی شخصیت اور ادبی حیثیت کی گہری چھاپ اس کے ذہن پر لگتی چلی گئی۔ اور اس کے لئے باعثِ تحریک بھی رہی۔ کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی جملہ ایسا ہوتا کہ یہ اس کے لئے کسی ذردانے سے کم نہ ہوتا۔ عورت ذات انھیں پسند تھی۔ خدا کا بہترین شاہکار، نبی کریم کی پسندیدہ شے۔ چنانچہ عورت ذات کی عزت و عظمت کرنا اُن کی سرشت میں شامل تھا۔ اب یہ اور بات ھے کہ عزت خود کروائی جاتی ھے۔ مردوں کے حلقوں میں سنجیدگی کا دامن تھام کر۔ یہ بتاتی چلوں کہ عزت، محبت، درس کے ساتھ حوصلہ افزائی تو ایسے ہر ادبی بزرگ سے ملتی رہی ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایک سیمنار میں جوگندر پال نے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا، یہ ادب اور جھجک کے ساتھ پاس والی کرسی پر ٹِک گئی۔ وہ کہنے لگے، "میں کسی کو رائے مشورے نہیں دیتا، لیکن۔ تمہارا ذوق وشوق دیکھ کر دل چاہتا ہے تمھیں وہ سب کچھ بتاؤں، سکھاؤں جو ہمیں ساٹھ برس کے بعد نصیب ہوا" اور پھر نصف گھنٹے تک وہ فکشن کی باریکیاں سمجھاتے رہے اور یہ اُن ذردانوں کو چنتی رہی۔ سن ۲۰۰۴ء میں اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "ذروں کی حرارت" آیا تو جے پور میں اجراء ہوا۔ سارے اہتمام ملکہ نسیم صاحبہ اور معظم علی نے کیا۔ وارث علوی سے اجراء کروانے کا فیصلہ بھی اُنھیں کا تھا۔ اسے معلوم ہوا تو کانپ گئی۔ "بھلا وہ کیوں آنے لگے"۔ لیکن صاحب، وہ آئے اور اپنی دو گھنٹے کی تقریر کی ابتداء اس جملے سے کی۔ "ثروت خان کا مجموعہ جب پڑھنا شروع کیا تو سوچا، نہیں جاؤں گا، لیکن جب ختم کیا تو میں نے ریزرویشن کروالیا"۔ وارث علوی کو قریب سے دیکھا، سنا، سمجھا اور پایا کہ وہ تو بڑے پیارے انسان ہیں۔ اُن کی شخصیت کمال کی ہے۔ ہر وقت درس، نصیحت اور کام کی باتیں، کوئی لاگ لپیٹ نہیں۔ اجراء سے قبل فرمانے لگے۔ "رسمِ اجراء کے موقع پر روایتاً تعریف وتحسین سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ثروت صاحبہ! آپ کے یہاں امکانات ہیں، اس لئے کچھ مشورے، کچھ نصیحتوں کے ساتھ خامیوں پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔ آپ دل مضبوط رکھئے گا"۔ اس خاتون کو تو گویا نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوگئی۔ اور یہ دولت اِس کو آج تک نصیب ہے۔ جو بھی لکھتی ہے، اُنھیں فون پر سُناتی ہے، لکھ کر بھیجتی ہے۔ بہت انہماک سے سنتے، پڑھتے ہیں۔ ابتداء میں تو خوب رہنمائی کیا کرتے تھے۔ لیکن "اندھیرا پگ" آنے کے بعد اسلوب کے قائل ہوگئے ہیں۔ بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مطالعہ کی تاکید نوکِ زبان پر رہتی ہے۔ ایک بار سیمنار کے پرچوں کے لئے کہا تھا "دیکھو جب تک کہنے کو کچھ نیا نہ ہو، سیمنار میں نہ جانا"۔ یہ جملہ اس خاتون کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے کیونکہ یہ خود کسی سے متاثر نہیں، نہ ہی کسی کا اثر اپنے اوپر غالب آنے دیا ہے۔ آج کے تخلیق کار قرۃالعین حیدر، ذکیہ مشہدی، اقبال مجید، سلام بن رزاق، پیغام آفاقی، غضنفر، نگار عظیم، طارق چھتاری، سید محمد اشرف ابن کنول کی تحریروں کی دلدادہ ہے لیکن خود کی سوچ، فکر اور خود کا انداز ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ اثر نہیں لیا کسی سے۔ یہی بات اسے تنقید کے ضمن میں بھی پسند ہے۔ یعنی تنقید ہو تو Orignal نیا خیال، نئی بحث، نئی ادائیگی کے ساتھ نئی فکر۔ لوگ کہتے ہیں، موضوع نیا ہونا چاہئے۔ یہ کہتی ہے۔ جب زندگی وہی، جہان وہی، انسان وہی۔ تو پھر موضوع کے نئے پن کے کیا معنی۔ بس حالات کے ساتھ کیفیات کی تبدیلی ضروری ہوتی ہے، اور انھیں کیفیات کے سبب، نفسیات کے پیچھے واقعات وسانحات کے بھنور اور انھیں میں اُلجھتا، سلجھتا انسان اور بھنوروں میں ڈوبتا تیرتا اُس کا وجود۔ ہاں مشاہدے کے ساتھ موضوعات کا تنوع ہوسکتا ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ بات یہ ہے کہ بات کہنی آنی چاہئے۔ ترسیل ضروری ہے۔ اِس کے لئے زبان میں بولیوں ٹھولیوں کو جگہ مل رہی ہے تو وہ اُس لفظ کے تہذیبی وسماجی پس منظر کا فطری تقاضہ ہے۔ آپ اُسے روکیں گے تو بے ساختگی اور فطری بہاؤ کے راستے میں علمیت وقابلیت کے پہاڑ کھڑے کردیں گے۔ اور آپ کا رشتہ منقطع ہوجائے گا ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب سے، اس کی زبانوں سے، اس کے کلچر سے۔ اُس کی زمین، اُس کے آسمان سے۔ دِلّی اردو اکادی کے ایک سیمنار میں ساجد رشید نے صدارت کرتے ہوئے کہا تھا "ثروت کے پرچے نے وارث علوی کی یاد دلادی"۔ سُن کر بہت محظوظ ہوئی تھی یہ۔ دل عش عش کر اُٹھا تھا اِس کا۔ بلاشبہ یہ جملہ وارث صاحب کی رہنمائی کا ثمر تھا اس کے لئے۔ ایسے ہی ایک بار ساہتیہ اکادی کے سیمنار میں اس کی Performance کو دیکھ کر زاہدہ حنا، جیلانی بانو اور اسی طرح کی سینئرس جب اسے شاباشی دے رہی تھیں تو مردوں کے ہجوم سے نکل کر پروفیسر نارنگ اس کے بالکل روبرو آگئے اور کہنے لگے، "آپ ہمارے سیمنار کی Discovery ہیں"۔

(جاری) ●●

ڈاکٹر شبنم عشائی
Ashai Manzil
Tapan Pattan (Kashmir)

—(1)—

اُداس مت ہونا
نظم مجھے بس سوچ رہی ہے
پر میں
تمہاری دہلیز پر
دیپک کی طرح جل رہی ہوں---
نظم کو تحویل میں دینے سے پہلے
میرا 'میں' جانے کب تک
تمہارے سجدے میں تھا
وہ تو سر اٹھانے پہ کھلا
کہ 'تم' تم میں نہیں تھے!
اس صدمے میں
میں نے میرے میں کو
نظم کی تحویل میں دے دیا تھا!
اُداس مت ہونا
تم جب بھی آؤ
مجھے جلتا ہوا
اپنی دہلیز پہ پاؤ گے---

—(2)—

جو میری دستک سنتے
اوبڑ کھابڑ رستے
ہمیں یوں نہ دھنتے!
ہم کتنے ہلکے ہو رہے ہیں
جیسے روئی کے گالے---
کیا تم اس عمل سے تھکے نہیں؟
دھونی کے تار ٹوٹ رہے ہیں
---آؤ ذرا
چاہت کی ایک انگڑائی لیں
بنا بوجھ کے من شاید
کچھ سجدے بچھا سکیں

—(3)—

شک وشبہ کی کھرونچوں سے
وفا کا چہرہ برباد نہ کرو
وفا خدا کے صحن کا پھول ہے
تم نے ویرانوں میں
بے اعتباری کے ناخن
بہت بڑھائے ہیں
معلوم ہے درد کی شبنم
ہر صبح اعتبار کا مصلیٰ بچھاتی ہے
---ایک لمحہ مقدس جی لو
وفا کا سجدہ کر لو

—(4)—

تم پاس تھے
میں اپنے ساتھ رو رہی تھی
تم چلے گئے تو ہر پل
تمہارے ساتھ گذرنے لگا
---اس بات کی گواہ
وہ سوندھی مہک ہے
جو وفا کے آنسوؤں سے
من کے بھیگ جانے پر
پھیلتی ہے
ہر شام---

—(5)—

تمہاری دغا
میری خطا ہے!
ریت کے ٹیلے پہ
عمارت بنتی ہے کیا؟
وفا کی نیو
من کی زمین پہ ڈلتی ہے
کیا تم نے کبھی
من سے سوچا ہے؟
کسی من کو دغا کی ریت سے
بھرتے ہوئے دیکھا ہے؟

اسرار اکبر آبادی
E3-600، شہید نگر، آگرہ-1
Mob: 07520472259

نیا سال اور ہم

رنگوں کی جھما جھم کیا کہنا، مخمور یہ موسم کیا کہنا
یہ سال نیا ہے سال نیا، لمحات کا سنگم کیا کہنا
گلزار گلابوں سے مہکے، باغوں میں پرندے بھی چہکے
دن رات کی اپنی محنت سے، کھیتوں کے سبھی گوشے لہکے
ماحول محبت کا ہے یہاں
دشمن بھی ہے ہمدم کیا کہنا ---یہ سال نیا ہے سال نیا
ارمان بھرے ہیں گیت یہاں، رومان یہاں سے اور کہاں
شعروں کی گلابی وادی میں، احساس کے دریا خوب رواں
ہم تم سے ہیں تم ہم سے ہو، صدیوں کا سہانا ہے بندھن
طوفان بلا آئے بھی، گئے، قائم ہی رہا اپنا گلشن
ایمان دھرم کے رشتوں کا
ہر سمت یہ سنگم کیا کہنا ---یہ سال نیا ہے سال نیا
یہ دل میں تمنا ہے اپنے ہر بھائی کا دم بھرتے ہی رہیں
جب تک ہے ہمارے دم میں دم، خدمات سدا کرتے ہی رہیں
آسان محبت کا رستہ،
ہمراہ ہے ہمدم کیا کہنا ---یہ سال نیا ہے سال نیا
لمحات کا سنگم کیا کہنا--- یہ سال نیا

احمر جلیسری
H.No.4, M. M.I.G,
Shaheed Nagar
AGRA-282001 (U.P)
Mob: 9359756301

لاکھ چلائیں انھیں حد ہی کے اندر رکھنا ۔۔۔ یہ ہیں کم ظرف انھیں گاؤں سے باہر رکھنا
پاک رشتے بھی غلاظت میں بدل جاتے ہیں ۔۔۔ راہِ اُلفت میں قدم سوچ سمجھ کر رکھنا
فتح ممکن نہیں اس دور میں حق گوئی سے ۔۔۔ جنگ لڑنی ہے تو خنجر بھی چھپا کر رکھنا
مال و زر لٹ گیا اب جان بھی جائے گی تری ۔۔۔ اپنے گھر میں نہ کسی شخص کو نوکر رکھنا
تبصرے ہونگے تیری جود و سخا پر احمر
تو نے جو درد سمیٹے ہیں چھپا کر رکھنا

عطاء الحق قاسمی
85-A, EME Society
Multan Road
Lahore (Pakistan)

کلکتہ کہانی!

روزنامہ جنگ، ہفتہ 11/12/2010

کلکتہ میں 3 تا 5 دسمبر 2010 کو انشاء کی سلور جبلی تقریبات اور رابندرناتھ ٹیگور کی یاد میں اُن کے 150ویں سال پیدائش پر بین الاقوامی مشاعرہ منعقد ہوا۔ ہمارے مند و بین میں ہمارے دیرینہ کرمفرما جناب عطاء الحق قاسمی بھی شامل تھے۔ تقریبات کے حوالے سے انہوں نے "جنگ" پاکستان میں اپنے مستقل سُپرھٹ کالم "روزنِ دیوار سے" میں چند قسطوں میں ایک رپورتاژ لکھا۔ یہاں روزنامہ "جنگ" کے شکریہ کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

کولکاتا سے ماہنامہ ''انشاء'' کے مدیر ف۔س۔اعجاز کا فون آیا کہ ان کے ادبی جریدے کی سلور جوبلی تقریبات کے موقع پر ''معاصر اردو ادب: تخلیق، مباحث، سروکار'' کے موضوع پر تین سے پانچ دسمبر 2010 تک ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہو رہا ہے جس میں وہ میری شرکت کے خواہشمند ہیں۔ ف۔س۔اعجاز سے ایک دیرینہ شناسائی اور کولکاتا سے برصغیر کی سیاسی، صحافتی، ادبی اور تہذیبی تاریخ میں جو گہرا تعلق رہا ہے اُس کے سبب میں نے فوراً ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ''قبول قبول قبول'' کہہ دیا۔ سو اس سفر میں لاہور سے اصغر ندیم سید اور جمشید مسرور میرے ساتھ تھے۔ جمشید کانفرنس میں شرکت کے لئے ناروے سے لاہور آپہونچے تھے جہاں سے انہوں نے ہمارے ساتھ کلکتہ کے لئے شریکِ سفر ہونا تھا۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن کراچی سے براہ راست کلکتہ پہنچیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی مندوبین کلکتہ پہنچ رہے تھے تاہم کانفرنس کے بارے میں باقی باتیں اگلے کالم میں ہوں گی۔ فی الحال میں آپ کو کلکتہ اور ف۔س۔اعجاز سے اپنے تعلق کی نوعیت بتانا چاہتا ہوں کہ اسی تعلق کی بنا پر میں نے کوئی ''نخرہ'' کئے بغیر اپنے دوست کی چاہت بھری دعوت ''چشم زدن'' میں قبول کر لی تھی۔

جہاں تک کولکاتا کا تعلق ہے یہ وہی شہر ہے جہاں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ''کارروائیوں'' کا آغاز کیا تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں اردو صحافت پھلی پھولی۔ قاضی عبدالغفار، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا چراغ حسن حسرت نے یہاں اپنے صحافیانہ جوہر دکھائے، اسی شہر میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی جہاں سے جدید اردو نثر کی روایت کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے اپنے استعماری عزائم کے فروغ اور برصغیر کو فارسی سے نابلد رکھنے کے لئے اردو کو پروموٹ کیا۔ لیکن ہر شر میں ایک نہ ایک پہلو خیر کا بھی ہوتا ہے۔ برصغیر کی سرکاری زبان فارسی تھی چنانچہ انگریز اگرچہ ایران، افغانستان، ترکی اور تاجکستان وغیرہ سے ہمارے لسانی بندھن کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں ہمیں اپنے ایک بہت بڑے تہذیبی، ادبی اور دینی خزانے سے بھی محروم کر دیا لیکن ہمیں اس کے عوض بہر حال ایک بہت خوبصورت اور میٹھی زبان مل گئی جو اب پوری دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ بقول داغؔ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ کولکاتا ہی تھا جہاں مرزا غالبؔ کئی ماہ کا سفر طے کر کے پہنچے تھے اور ایسٹ انڈیا کی پھیلائی ہوئی نئی تہذیب کی روشنی سے ان کی آنکھیں اتنی چکا چوند ہو گئیں کہ سرسید احمد خان نے انہیں اپنی تصنیف ''آئینِ اکبری'' کا دیباچہ لکھنے کے لئے کہا تو انھوں نے دیباچے میں لکھا کہ سید صاحب یہ کیا آپ ''آئینِ اکبری'' کے بوسیدہ اوراق پر فدا ہو رہے ہیں، ایک نئی تہذیب کی آمد آمد ہے۔ آپ اس طرف توجہ دیں، سرسید نے غالب کا یہ دیباچہ اپنی کتاب میں شامل تو نہیں کیا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ بعد میں سرسید احمد خان اکبر الٰہ آبادی کے طنزیہ تیروں کی

بارش کے باوجود نئی قدروں کے فروغ کے لئے کام کرتے رہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ روشن خیال اقبالؒ اور روشن خیال سرسید دونوں عورتوں کی تعلیم کے آخری دم تک مخالف رہے بلکہ بعض قدروں کے حوالے سے سرسید تو اقبالؒ سے بھی ایک قدم آگے تھے۔ ایک دفعہ انگریز وائسرائے نے سرسید سے کہا کہ ان کی اہلیہ آپ کی بہو سے ملنا چاہتی ہیں مگر سرسید نے یہ ملاقات کرانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میری بہو ایک پردہ دار خاتون ہے وہ کسی بے پردہ خاتون سے ملاقات نہیں کر سکتی۔ بات ذرا لمبی ہوگئی، میں آپ کو کلکتہ کے تاریخی پس منظر کی باتیں بتا رہا تھا جو میرے حالیہ ''دورۂ کلکتہ'' کی وجوہات میں سے ایک وجہ بنا۔ انگریزوں نے واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے کلکتہ کے مٹیا برج میں رکھا تھا۔ اس شہر سے ہندوستان کے آخری مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا بھی تعلق رہا ہے۔ انگریزوں نے ان کے بیٹوں اور دیگر اعزاء کو ان کے سامنے بہیمانہ طریقے سے قتل کر کے انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں رنگون بھجواتے ہوئے کچھ عرصہ کلکتہ میں رکھا جہاں ان کی ملاقات انگریز کے ایک اور قیدی واجد علی شاہ سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ نے اس اسیری اور کسمپرسی کے عالم میں بھی اپنے شہنشاہ کو شہنشاہ ہی کا پروٹوکول دیا۔ کلکتہ سے وابستہ ہماری یادیں اگرچہ اتنی خوشگوار نہیں ہیں لیکن ان حوالوں نے اس شہر کی تاریخی اہمیت میں بہر حال اضافہ کیا ہے اور اس کی تاریخ ہی اس شہر میں میری دلچسپی کی باعث تھی!

اور جہاں تک ف۔س۔ اعجاز سے دیرینہ آشنائی کا تعلق ہے تو صرف ایک واقعہ کے حوالے سے یہ مختصر سی روئیداد بھی سن لیں۔ آج سے بیس برس قبل میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے ناروے گیا تو مجھے ایک گھنگریالے بالوں والا ایک خوبرو نوجوان ملا۔ اس نے مجھے روک کر پوچھا ''آپ عطاء الحق قاسمی ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا ''آپ میرے مقروض ہیں لہٰذا جتنی جلدی ہو سکے میرا قرض واپس کریں''۔ میں نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا اس سے پہلے میری آپ سے کبھی ملاقات ہوئی ہے؟'' اس نے کہا ''نہیں، آج ہم پہلی بار مل رہے ہیں!'' میں نے پوچھا ''پھر میں آپ کا مقروض کیسے ہوا؟''۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے سوال کر دیا ''کیا خواجہ اینڈ سن کی ڈرامہ سیریل آپ نے نہیں لکھی؟''۔ میں نے جواب دیا ''ہاں یہ ڈرامہ سیریل میرا ہی ہے''۔ وہ خوبرو نوجوان بولا ''میرا نام ف۔س۔ اعجاز ہے۔ میں کلکتے میں رہتا ہوں اور آپ کے اس سیریل کے بیس سیٹ اپنی جیب سے خرید کر میں نے اپنے دوستوں میں تقسیم کئے ہیں، لہٰذا نکالیں پیسے!''۔ مجھے یہ قرض خواہ بہت اچھا لگا، میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سو کلکتہ میں ایک بڑی بین الاقوامی کانفرنس کا ڈول اسی نوجوان نے جواب ادھیڑ عمر ہے، ڈالا تھا اور اس میں مجھے شریک تو ہونا ہی تھا کہ میں اس کا مقروض تھا!

مقالوں بھری رات!

روزنامہ جنگ، جمعرات 16/12/2010

کولکاتا میں منعقدہ ماہنامہ انشاء کی سلور جوبلی تقریبات کے تین دنوں میں اتنے پر مغز مقالات سننے کو ملے کہ اس نوع کے مقالات کے لئے جو کوٹہ میں نے ایک سال کی مدت میں پورا کرنا ہوتا ہے وہ ان تین دنوں میں صرف ہوگیا، چنانچہ کولکاتا سے واپس آئے ایک ہفتہ ہوگیا ہے لیکن اتنا سیر چشم ہوں کہ میں نے ابھی تک کسی مقالے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، یہ مقالے تھے بھی رنگ برنگے مثلاً ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے مقالے کا موضوع ''اردو افسانوں میں سائنسی شعور'' تھا، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط باقاعدہ شرعی وضع قطع کے حامل تھے، چہرے پر خوبصورت داڑھی، شلوار قمیص، سر پر رومال، میں نے ان سے ''نشیط'' کا مطلب پوچھا تو انہوں نے ''ہینڈسم'' بتایا اور ان کے ہینڈسم ہونے میں شبہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے مقالہ بھی بہت محنت سے لکھا تھا سو میں نے بھی اتنی ہی محنت سے دل لگا کر سنا اور ان کی علمیت اور تجزیے سے متاثر ہوا، مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس خوبی نے بہت متاثر کیا کہ پابند شریعت ہونے کے باوجود ان میں تنگ نظری نام کو بھی نہیں تھی۔ محترمہ اندرا شبنم نے خواتین ''فنکاروں کی نفسیاتی الجھنیں'' کو اپنا موضوع بنایا، مگر انکے مقالے میں خواتین کی الجھنیں' نہیں خواتین کے مسائل بیان ہوئے تھے۔ مجھ سے اگر کانفرنس کے مدارالمہام ف۔س۔ اعجاز نے ''مرد فنکاروں کی نفسیاتی الجھنیں'' کے موضوع پر مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہوتا اور شکر ہے نہیں کہا تو مرد فنکاروں نے میرا حقہ پانی بند کردینا تھا۔ ایک دفعہ میں اپنے ایک مرد فنکار کے دفتر میں بیٹھا تھا جو ایک اخبار کے لئے ''نفسیاتی الجھنوں کا حل'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتے تھے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتے اور ہر بار اٹھ کر باہر جاتے۔ میں نے پوچھا برادرم کیا مسئلہ ہے؟ بولے ''گیارہ بجے عطاء الحق قاسمی نے آنا تھا۔ وہ ابھی تک آئے نہیں۔'' بات اندرا شبنم صاحبہ کی ہورہی تھی، محترمہ رقاصہ بھی ہیں، ماہر نفسیات بھی ہیں، شاعرہ بھی ہیں اور ایک اچھی بات یہ ہے کہ انڈیا میں رہائش پ۔ پذیر غیر مسلموں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے اردو کے ساتھ اپنا ناطہ ابھی تک برقرار رکھا ہوا ہے، بہر حال متذکرہ اجلاس کی صدارت اپنے اصغر ندیم سید نے کی۔ یہ ''نوجوان'' بحث کو سمیٹنے کا ہنر جانتا ہے، سو اس نے یہاں بھی یہ ہنر خوبصورتی سے آزمایا اور حاضرین سے اتنی داد سمیٹی کہ آئندہ چھ ماہ تک بغیر داد کے بھی اس کی گزر بسر ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو کالم کے آغاز میں بتایا کہ اس کانفرنس میں بہت پر مغز مقالے پڑھے گئے جن میں نصرت ظہیر نے ''ہم عصر اردو ادب میں طنز و مزاح'' ڈاکٹر شمیم انور نے ''مغربی بنگال میں ہم عصر اردو غزل'' ابو ذر ہاشمی نے ''مغربی بنگال میں ہم عصر اردو نظم'' اصغر ندیم سید نے ''پاکستان کا ہم عصر اردو ڈرامہ'' ظہیر انور نے ''مغربی بنگال میں اردو ڈرامہ'' ڈاکٹر مہ جبیں انجم نے ''معاصر اردو ناول نگاری'' جمشید مسرور (ناروے) نے ''اسکینڈے نیویا میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال'' ڈاکٹر لطیف احمد (بنگلہ دیش) نے ''بنگلہ دیش میں اردو کا موجودہ تخلیقی ماحول'' ڈاکٹر وسیم بیگم (دہلی) نے ''تانیثی ادب کی تخصیص اور اس کے سروکار'' ڈاکٹر شبنم عشائی (سری نگر) نے ''نسائی شاعری میں احتجاج'' ڈاکٹر فاطمہ حسن (کراچی) نے ''صنفی تفریق اور معاصر فنکار'' کے موضوعات پر گرانقدر مقالات پڑھے۔ ان کے علاوہ بہت خوبصورت گفتگو مختلف سیشنوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شافع قدوائی، اصغر ندیم سید، جناب احمد سعید ملیح آبادی (ممبر راجیہ سبھا) جناب سلطان احمد (وزیر مملکت برائے سیاحت) جناب اتپل چٹرجی (شیریف کولکاتا) اور محترمہ بھارتی رے چیئر پرسن، انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز (کولکاتا) سے سننے کو ملی۔ بمبئی سے گلزار بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کا ایک افسانہ اور محفل مشاعرہ میں ان کی دل میں اتر جانے والی نظمیں ''حاصل کانفرنس'' تھیں۔ ایک اجلاس کی صدارت میری اور ایک گلزار کی بھی تھی، مگر ہم دونوں نے بابا بلھے شاہ کے مشورے ''علموں بس کریں او یار'' پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہلکی پھلکی باتیں کیں۔ ف س اعجاز نے مختلف اجلاسوں کی نظامت بڑے مناسب ہاتھوں میں دی ہوئی تھی، چنانچہ ڈاکٹر نعیم انیس، ظہیر انور، اور محترمہ نصرت جہاں نے اجلاس کی کارروائیوں سے حاضرین کی دلچسپی برقرار رکھی۔

ماہنامہ'' انشاء'' کی سہ روزہ تقریبات میں ایک تقریب محفل مشاعرہ کے حوالے سے بھی تھی، سو یہاں شعرائے کرام خوب ''غزلو غزلی'' ہوئی۔ نظم سنانے والوں میں صرف گلزار، اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر شبنم عشائی تھے اور یہ بات ایک بار پھر ثابت ہوئی کہ غزل کی مقبولیت اپنی جگہ لیکن اگر نظم نگار'' شاعر'' ہے تو وہ داد سمیٹنے میں غزل گو کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہے بلکہ اس محفل میں ایک نقطہ یہ بھی سامنے آیا کہ شاعری کے لئے میٹر میں ہونا اگر چہ بہت ضروری ہے لیکن اگر ''پوئٹک تھاٹ'' بہت توانا ہو تو نثری نظم کو بھی خالص شاعری کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے اور اس کا ثبوت محفل میں سنائی گئی شبنم عشائی کی نثری نظموں نے دیا۔

اس طرح کی محفلیں ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں، سو اگر چہ میں نے کانفرنس کے سبھی مندوبین کو اپنے اپنے

موضوع پر مضبوط گرفت کا حامل پایا لیکن تین چار شخصیتیں خصوصاً ایسی تھیں جن کی شخصیت کے کچھ نئے پرت میرے سامنے آئے۔ اس کا احوال میں اپنے اگلے کالم میں بیان کروں گا اور ہاں اس کانفرنس میں جن دوستوں نے ف۔س۔اعجاز کا ہاتھ بٹایا اور یوں وہ اتنی یادگار کانفرنس کرنے میں کامیاب ہوئے ان میں روزنامہ ''اخبار مشرق'' کے جناب امان اللہ محمد سر فہرست تھے بلکہ اعجاز کے بقول اوپر اللہ نیچے امان اللہ، ان کے علاوہ مغربی بنگال اسمبلی کے 25 سال تک اسپیکر کے فرائض انجام دینے والے جناب ہاشم عبدالحلیم بھی کانفرنس کے انعقاد کو آسان بنانے والوں میں شامل تھے۔

اب آخر میں گلزار کی ایک بے خوبصورت نظم ''پڑوسی'' آپ کی نذر ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس میں کوئی ''سرحدی خلاف ورزی'' نہیں کی گئی بلکہ تخلیقی سطح پر دونوں ملکوں کے دکھ اور سکھ سانجھے بتائے گئے ہیں اور ان کی خودمختاری اور سالمیت کا احترام کیا گیا ہے۔

نظم ملاحظہ ہو:

پڑوسی

جب تک میرے سامنے والے گھر میں روشنی جلتی ہے
میرے کمرے کی دیوار پہ
اس گھر کی پرچھائیاں چلتی رہتی ہیں
اک وہیل چیئر ہے
دھکا کھا کے دائیں بائیں گھومتی رہتی ہے
اس گھر کی دو پالتو چڑیاں اڑتی ہیں تو میری اس دیوار
سے ٹکرا جاتی ہیں
اس گھر میں لٹکا اک پنجرہ میرے گھر کا پنجرہ لگتا ہے
جانے کون سی کھڑکی بند ہوتی ہے، جس کی جالی سے
دیوار پہ جیل کا دروازہ بن جاتا ہے
آتے جاتے لوگ سبھی قیدی لگتے ہیں
ننگا لٹکا بلب کبھی ہل جائے تو
لوگ ہوا میں اڑنے لگتے ہیں
اک سرکس لگ جاتی ہے
کچھ دیر غدر مچ جاتا ہے
پھر وہ کھڑکی کھل جاتی ہے
اور کوئی بتی جلتی ہے
دو جھولتے سائے لپٹے لپٹے، بالکنی میں، آ کے کھڑے
ہو جاتے ہیں
شاید میرے گھر کی جانب دیکھ رہے ہیں
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
اس گھر کے دھوئیں کی پرچھائیں، میری دیوار پہ پڑتی ہے
تب لگتا ہے......
دونوں گھروں میں آگ لگی ہے!!!

حاصل سفر!

روزنامہ جنگ، جمعہ 17/12/2010

جیسا کہ میں نے اپنے گزشتہ کالم میں عرض کیا تھا کہ دوسرے شہروں اور دوسرے ملکوں میں منعقد ہونے ولی تقریبات کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ پڑھتے چلے آ رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا ہوتا، یہ موقع ان تقریبات میں میسر آجاتا ہے بلکہ کچھ لوگوں کو آپ نئے سرے سے دریافت کرتے ہیں۔ ان تقریبات کا ایک ''بونس'' یہ بھی ہے کہ کچھ لکھاری جن کی تحریریں آپ تک نہیں پہنچی ہوتیں، آپ کی ان تک بھی رسائی ہو جاتی ہے انہیں ملنے اور انہیں سننے کا موقع ملتا ہے اور یوں کئی ایسے گوہر نایاب دریافت ہوتے ہیں جن کی قدر و قیمت سے آپ پہلے آگاہ نہیں تھے۔ کولکاتا میں گزرے ہوئے چار دنوں میں، میں ایسے کئی تجربات سے گزرا، مثلاً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ماضی میں میری متعدد ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی سیمیناروں میں ان کے مقالے اور تقریریں سننے کا اتفاق ہوا، اس کے علاوہ ان کی متعدد کتابوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا لیکن ان کی شخصیت، ان کے علم اور ان کی خطابت کا جو ''رعب'' اس مرتبہ میرے دل میں بیٹھا، میں اس سے آج تک ''بچا'' ہوا تھا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کا کلیدی خطبہ تھا، جس کی تیاری انہوں نے پہلے سے کی ہوگی۔ چنانچہ وہ میرے لئے متاثر کن نہیں تھا کہ جانتا تھا ڈاکٹر صاحب عالم آدمی ہیں، ان کا حافظہ بھی بلا کا ہے چنانچہ ان کے لئے یہ کوئی ایسا معرکہ نہیں تھا جس میں وہ فتح کا جھنڈا نہ لہرا پاتے، البتہ ہر سیشن میں پڑھے جانے والے مقالوں کے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جو ''فی البدیہہ'' خطابات فرمائے، وہ حیرت انگیز تھے، ان کی مربوط گفتگو سے لگتا تھا لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہے ہیں، ایک ایک لفظ نگینے کی

طرح جڑا ہوا، اسے اپنی جگہ سے ہلانا ممکن نہیں تھا، مختلف موضوعات پر خطاب کرتے ہوئے علم کا ایک بپھرا ہوا دریا جس کی اوپر کی سطح ایک نرم خوندی کی طرح پرسکون۔ اس کے علاوہ Clarity of Thought کہیں کوئی الجھاؤ نہیں۔ اردو زبان خوش قسمت ہے کہ اسے ایک ایسا سکالر ملا ہے جس کی ان خوبیوں میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ ہندوستان میں اردو کو شدید مشکلات کا سامنا ہے اور بدقسمتی سے زبان کو بھی بسا اوقات مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے، ان حالات میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور چند دوسرے غیر مسلم اہل قلم جو اردو کو ذریعہ اظہار بنائے ہوئے ہیں، اس کے رستے کی مشکلات کم کرنے میں کوشاں ہیں۔ اردو سے محبت کرنے والوں کی نظروں میں مزید قدر و قیمت کے حامل قرار پاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ان میں سرفہرست ہیں۔

کلکتہ میں میری ملاقات اپنی ایک محبوب شخصیت گلزار سے بھی ہوئی۔ اس سے پہلے لاہور میں ان سے دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں، لیکن کولکاتا کی ملاقاتوں میں ان کی محبوبیت کا ایک لازوال نقش میں نے اپنے دل پر محسوس کیا، وہ بمبئی فلم انڈسٹری کی مصروف ترین اور مقبول ترین شخصیت ہیں، اسے ف۔س۔ اعجاز کا ''اعجاز'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہیں تین دن تک مسلسل اپنے حصار میں رکھا ایک انتہائی منکسر المزاج شخص، نہ کوئی اکڑفوں، نہ کوئی ہدف زنی ورنہ شو بز کے لوگ ذرا سی شہرت اور مقبولیت سے غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔ اندر کی خوبصورتی کے علاوہ باہر کی خوبصورتی اس پر مستزاد۔ خوبصورت سفید بال، سفید مونچھیں، سفید رنگت، کڑکڑ کرتا مائع لگا سفید کرتا، سفید پاجامہ اور چہرے پر دلآویز مسکراہٹ انہوں نے محفل افسانہ میں اپنا افسانہ سنایا اور مشاعرے میں اپنی اثر انگیز نظمیں بھی سنائیں۔ وہ سر سے پاؤں تک شاعر ہیں، تخلیقی انسان ہیں اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔

لاہور سے ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے، میں نے بغیر پڑھے اس کا دیباچہ لکھ دیا کہ جس پر کتاب تھی، میں نے اسے پڑھا ہوا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات کے صدر ڈاکٹر شافع قدوائی سے بھی یہاں تفصیلی ملاقاتوں کا موقع ملا، میں نے انہیں الحمراء آرٹس کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے لاہور میں منعقدہ سہ روزہ انٹرنیشنل کانفرنس میں مدعو کیا تھا لیکن بطور منتظم اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکا تھا جبکہ کولکاتا میں ہم دونوں ''ویلے'' تھے، ان کی شخصی خوبیوں کے علاوہ ان کی علمی فراوانی اور تقریر کی صلاحیت نے مجھے متاثر کیا، میرا خیال ہے کہ وہ مستقبل کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ اسی طرح یہاں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مندوبین سردار پنچھی اور پروین کمار اشک سے بھی ملاقاتوں کا موقع ملا، سردار پنچھی مختلف علوم و فنون میں رواں نظر آتے ہیں جبکہ پروین کمار اشک صرف شاعر ہیں، ان دونوں کی کتابیں میں اپنے ساتھ لایا ہوں میں نے جتنا تھوڑا بہت انہیں پڑھا ہے، مجھے یقین ہے ان کی کتابیں پڑھنے کے بعد میں خود کو ان سے زیادہ قریب محسوس کروں گا، ان دوستوں کے علاوہ دو شخصیتیں اور بھی ہیں جن سے ملنا بہت اچھا لگا، ایک کولکاتا کے ظہیر انور اور دوسرے سری نگر کی ڈاکٹر شبنم عشائی۔ ظہیر انور ڈرامے کے آدمی ہیں اور انہوں نے مغربی بنگال میں ڈرامے کی تاریخ پر بہت خوبصورت مضمون پڑھا۔ شبنم عشائی فلسفے میں پی ایچ ڈی ہیں اور وجودیت پر ان کی انگریزی میں لکھی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے تاہم میرے نزدیک ان کی اہمیت ان کی انتہائی پرتاثیر نثری نظموں کی وجہ سے ہے جو درد انگیز ہیں، ان میں اتنا کرب ہے کہ کوئی حساس پڑھنے والا یہ نظمیں مسلسل نہیں پڑھ سکتا۔ مجھے اس خاتون کے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' لگانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ سر سے پاؤں تک شاعرہ ہیں اور یوں انہیں کسی لاحقے سابقے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے ابھی کچھ باتیں اور بھی کرنا تھیں لیکن یہ سطور بھی میں نے جلدی جلدی گھسیٹی ہیں کیونکہ ایک سفر کے لئے پابہ رکاب ہوں اور شکر ہے یہ ایسا سفر ہے، جس میں میرا ہاتھ باگ پر بھی ہے اور پاؤں رکاب میں بھی ہیں: غالب کی ہمسری کون کر سکتا ہے؟ آخر میں میرے کالم کے لئے ظفر اقبال کی عطا کردہ تازہ غزل:

ظفر اقبال

صرف کیا تقریر نہ تحریر سے ہم نے
رکھی بھی عداوت کوئی تاثیر سے ہم نے

قابو میں آتا نہیں تھا یہ دل وحشی
باندھا اسے آخر تری زنجیر سے ہم نے

اپنی ہی کرامات دکھاتے رہے سب کو
سرقہ نہ کیا معجزۂ میر سے ہم نے

اکثر تو اکارت ہی گئی خاکِ تماشا
سونا بھی بنایا اسی اکسیر سے ہم نے

سرزد ہوئے کچھ وقت سے پہلے ہی کم و بیش
کچھ کام کئے ہیں ذرا تاخیر سے ہم نے

کچھ نیند میں بھی جاگتے رہتے تھے ہم اکثر
کچھ دور رکھا خواب کو تعبیر سے ہم نے

کچھ کی صف احباب پہ دھوکے سے چڑھائی
کچھ کام لیا نعرۂ تکبیر سے ہم نے

پایا تھا، ظفر کوششِ بسیار سے جس کو
کھونا بھی ہے اس کو بڑی تدبیر سے ہم نے

●●

چندر بھان خیال
H.No -23 , Gali No -14,
B- Block, Kaushik Enclave, Burari
New Delhi- 110084

عالمی بازار

کچھ تو بدل رہا ہے
کچھ نہیں، بہت کچھ بدل رہا ہے۔
ہاں! بہت سارا بدل رہا ہے۔
میں بدل رہا ہوں
میرا اطراف بدل رہا ہے
میرا ملک بدل رہا ہے
نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے
پورا معاشرہ نئی راہ پر چل رہا ہے
وراثت گل رہی ہے، تمام اثاثہ پگھل رہا ہے
آگ لگی ہے، سارا جنگل جل رہا ہے۔
جنگل جنگل پیڑ اُگ آئے ہیں
لندن، پیرس، نیویارک
ٹوکیو، بیجنگ، سیول، واشنگٹن
چھوٹے چھوٹے ہی سہی لیکن ہیں تو بڑے پیڑوں جیسے
جنگل نہیں تو
لکڑی بھی نہیں ہے
لکڑی نہیں تو چولھے کی آگ کہاں سے آئے گی
روٹی کیسے بنے گی، دال کہاں گلے گی؟
ارے ضرورت کیا ہے
چولھے چوکا یا دال روٹی کی
فرصت کسے ہے یہ سب کرنے کی
شہروں میں لوگ فاسٹ فوڈ کھاتے ہیں
جو گھر میں نہیں بازار میں بکتا ہے۔
جنگل نہیں تو
تیندو کے درخت بھی نہیں
یعنی تیندو پتے نہیں
مطلب صاف ہے
اب بیڑی نہیں بنائی جائے گی
لیکن ضرورت بھی کیا ہے بیڑی کی
شہروں میں تو سگریٹ پینے کا رواج ہے
بیڑی بنانے کا ایک کاروبار ہی تو بند ہوا ہے
شہروں میں تو روزگار کے مواقع بے شمار ہیں
خوب کماؤ اور سگریٹ پیو
بازار میں میڈ اِن لندن سگریٹ خوب بکتا ہے
جنگل نہیں تو
جڑی بوٹیاں بھی ناپید ہیں
جڑی بوٹیوں کی عدم موجودگی کا مطلب ہے
ہمارے آیورویدک طریقۂ علاج کی موت
طب یونانی کو دیش نکالا
لیکن اب دیسی علاج کی ضرورت کیا ہے
دیر تک بیماری اور لمبا علاج
شہر کی آب و ہوا کو راس نہیں
یہاں تو فوراً چست درست ہو کر
کام پر جانا پڑتا ہے
شہر میں پڑوسی حال چال نہیں پوچھتا
لہٰذا ایلوپیتھی طریقۂ علاج ہی کارگر ہے
اور یہ آسان بھی ہے
کام پر ڈٹے رہیے، جیب بھری رکھیے
غیر ملکی کمپنیوں کی سبھی دوائیں
سستے داموں پر ہر وقت
بازار میں دستیاب ہیں۔
جنگل نہیں تو
قدیم قبائلی بستیاں بھی نہیں
اندھیروں کو روشن کرتی
قدرتی مسکراہٹ بھی نہیں
انسان کی سادگی، بھولپن اور معصومیت
محبت، عقیدت، عبادت، سعادت
سب غائب
بے لباس تو ہم آج بھی ہیں
لیکن بے لباسی کا لطف اور تقدس اب کہاں؟
شہر میں ضرورت بھی کیا ہے ان سب کی
یہاں تو بے لباسی کا مطلب
خوبصورت لباس ہے
مغرب سے درآمد شدہ یہ لباس
بازار میں دھڑلے سے بک رہا ہے۔
جنگل نہیں تو
قدیم قبائلیوں بستیوں کی کوکھ سے جنمے
تمام دیہات اور قصبات
شہروں کی شکل میں نیا اوتار لے چکے ہیں
چوپالیں، چبوترے، چارپائیاں سب نایاب
نہ گوری ہے اور نہ گائے ہے
نہ گھونگھٹ ہے اور نہ پنگھٹ ہے
رسمیں، قسمیں، وعدے، ارادے
سہیلیاں اور پہیلیاں وغیرہ
یہ سب بے معنی ہیں شہر میں
ہماری قدیم تہذیبوں کے آثار
علم و ادب، رقص و موسیقی کے نقوش
ہماری آن، بان اور شان
آریہ ورت، بھارت، ہندوستان
فضول باتیں مت کرو
اب ہم شہر میں رہتے ہیں
یعنی اب ہم سب
کسی ملک کے باشندے نہیں
ایک بڑے بازار کے امیں ہیں۔
جنگل نہیں تو
جنگل کی وہ دلکش دنیا بھی نہیں
تشدد، خوف اور خون
اور پھر بھرپور امن و سکون
کچھ بھی تو نہیں
اب تو جنگلی جانور بھی نہیں
انسان اور جانور کی ہم رشتگی
پیار اور ایثار کے افسانے بھی نہیں
جنگل کے وہ دیوانے بھی نہیں
بولی ٹھولی، دھوم دھڑاک
گیت گالی، تو تڑاک
شہر میں یہ سب نہیں چلتا
یہاں مہذب اور مغربی انداز میں گفتگو لازمی ہے
ہندی اردو بھی مغرب کے لہجے میں ہو
بازار کی زبان یوں تو انگلش ہے
لیکن تم ٹھہرے مشرق کی اولاد
لہٰذا ہنگلش سے کام چلا سکتے ہو
رفتہ رفتہ انگلش آ جائے گی
ذات، پات، مذہب، دھرم، عقیدے
یہ سب گھر میں زیب دیتے ہیں
بازار میں تو بازاری پن چاہیے۔
گھل ملا کر ہمیں
بازار بن کر رہنا پڑے گا
یہ عالمی بازار ہی ہمارا مستقبل ہے۔

بازار بلی ماران: دلّی کے تمدن کا گہوارہ تھا

فیروز بخت احمد

202A, Adeeba Market & Apartments, Near Rahmani Masjid,
Main Road, Zakir Nagar, New Delhi-110025
Phone:2698-4517, 2698-4238 (M) 91-9810933050
Email : firozbakhtahmed07@gmail.com

دہلی نہ صرف عظیم جمہوری ہندوستان کی دارالحکومت ہے بلکہ یہ ہندوستان کا دل بھی ہے۔ تاریخ ہند کے تقریباً تمام ادوار میں اِسے مرکزیت حاصل رہی نتیجتاً یہاں جو ثقافت فروغ پائی وہ عرصۂ دراز سے مرجع خلائق ہے۔

اِس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی وراثت، ثقافتی رنگارنگی اور تاریخی کردار کے نقطۂ نظر سے ہند اصغر ہے۔ دہلی محض ایک شہر ہی نہیں بلکہ صدیوں سے ہندی تمدن کا مرکز رہی ہے۔ اِس شہر دہلی کے مقبرے، قلعے و بلند و بالا مینار اُس کی عظمت رفتہ کے مظہر ہی نہیں بلکہ ہر باشندۂ دہلی اُس کی زندہ جاوید مثال ہے۔ اِس شہر کی قدامت کا اندازہ تو اِسی عنصر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اوبرائے ہوٹل کی بنیادوں سے نکلی مٹی نے ایک کیمیائی تجریہ کے ذریعہ اِس حقیقت کا اِنکشاف کیا کہ دلی ہمالیہ سے بھی قدیم ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شاہجہاں آباد، دہلی ہندوستان میں ایک حسین ترین دُلھن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس شہر کی کشش اور جاذبیت کا حال یہ ہے کہ جو یہاں آیا، بس یہیں کا ہو رہا۔

معروف مورخ مبیش وردیال نے دہلی کی تمدنی زندگی سے متاثر ہوکر اپنے تاثرات کا اظہار اِن لفظوں میں کیا، ''دل لے لیتی ہے ہر کسی کا، جبھی تو اِس کا نام ''دل لی'' ہے!۔ اِس کے حسن کے جلووں، اِس کی اِمارت اور شان و شوکت اور اِس کی تہذیب و تمدن کی روشنی چہار دانگ عالم میں پھیلی ہے۔ ہزاروں سال سے نہ صرف اپنے ملک کے باشندے بلکہ غیر ممالک کے لوگ بھی اِس کے دل دادہ اور شیدائی رہے ہیں۔ اِنقلابات آتے رہے لیکن دِلّی مٹ مٹ کر اُبھرتی رہی اور ہر بار اِس کے نقش و نگار میں ایک نیا اور انوکھا نکھار پیدا ہوا۔ اِس اعتبار سے دلی ''شہرِ جاوداں'' کہلائی۔

شاہجہاں آباد ایک شہر ہی نہیں، بلکہ ایک تہذیبی روایت ہے۔ اصفہان، غرناطہ، سمرقند، بخارا، استنبول، بغداد، کابل اور قاہرہ کی طرح شاہجہاں آباد کی عظمت پارینہ سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ترکوں کے زمانہ حکومت میں اِس کے محلوں میں علما، فقہا اور صاحب کمالوں نے چہار دانگ عالم سے یہاں آکر سکونت اختیار کی۔ مغلوں کی حکومت میں نئے سرے سے بابر نے اِسے بسایا۔''

(ماخوذ از ''عالم میں اِنتخاب دلّی'')

راقم کو اپنے اسلاف کی دِلّی بیحد عزیز ہے۔ افرادِ خاندان یعنی مولانا آزاد، مولانا خیرالدین، شیخ محمد ہادی، شیخ محمد افضل، شیخ محمد حسن و شیخ جمال الدین بہلول دہلوی صدیوں سے دہلی کے نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتے رہے۔

دہلی سے متعلق سمعی و بصری تجربات نیز دانشوران واُدبا کی تحریروں نے دل و دماغ کو فرحت افزا حقائق سے آشنا کیا۔ دہلی کی رواداری، قومی یکجہتی اور اُنسیت کے عناصر ہر ذی شعور کے رگ و پے میں سرایت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو راقم مذکورہ عناصر کا کیوں کر قدرداں نہ ہوتا۔

میری وِلادت بلی ماران، گلی قاسم جان کے محلّہ احاطہ کالے صاحب میں ہوئی۔ محلّہ کے تاریخی اوراق اُس کے جاں بازوں کے خونِ جگر کے غماز ہیں۔ بازار بلی ماران ہند میں معاشرتی معیار کا علمبردار صدیوں صدیوں سے رہا ہے۔ علاقہ مذکورہ اِس قدر مردم خیز ہے کہ ایسے ایسے سپوتوں کو جنم دیا جنھوں نے ہند کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ حالات سے نبرد آزمائی کی صورت میں کنارہ کش ہونے کے بجائے دیوانہ وار مقابلہ کرتے کرتے جام شہادت نوش کیا۔ ایسے ہی افراد کی تاریخ سنہری اورق میں لکھی جاتی ہے۔

علاقہ بلی ماران کی وجہ تسمیہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ وجہ تسمیہ سے متعلق دو حکایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مغلوں کے بعد انگریز دہلی پر غاصب ہوئے۔ اُن کی سرکار میں ایک اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کمشنر مسٹر بلی مور یا ہوا کرتے تھے۔ علاقہ بلی ماران سے اُنھیں ذہنی لگاؤ تھا۔ اِتفاق سے اُن کے دفتر کی جائے وقوع بھی یہ علاقہ ہی تھا۔ پروفیسر ریاض عمر کے خیال میں، اِنہی بلی موریا کا نام بگڑ کر بلی ماران ہوگیا۔

دوسری حکایت یوں کہ ''نہر بہشت'' یا ''فیض نہر'' کے نام سے ایک نہر چاندنی چوک کے وسط میں بہا کرتی تھی۔ نہر مذکورہ سرمور کی پہاڑیوں سے ہوتی ہوئی جمنا اور لال قلعہ سے ہوکر نجف گڑھ تک جاتی تھی۔ چاندنی چوک میں بادبان بھی ہوا کرتے تھے۔ جس چپوار سے کشتی چلاتے تھے، اُسے بَلّی کہا جاتا تھا۔ چوں کہ یہ لوگ زیادہ تر علاقہ بلی ماران میں رہا کرتے تھے لہٰذا، محلّہ کو بلی ماروں کا محلّہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ کوئی اِس خطہ کو بلی ماران کہتا ہے، کوئی بلی مارو تو کوئی بلی ماراں کہتا ہے۔

باشندگانِ خطہ بلی ماران کے اوصافِ حیبہ میں خوش خلقی، متانت و مستقل مزاجی اور خودداری نیز اِنکساری کے عناصر نمایاں تھے۔ اُنھیں درویشانہ زندگی عزیز تھی۔ دُنیا سے زیادہ اُنھیں عقبیٰ کی فکر دامن گیر ہوتی تھی۔ اُن کی نظروں میں معاشی بلندی معیارِ سرخ روئی نہ تھا۔ ہمیشہ سے اُنھوں نے مادّی خوشحالی کو نظرِ حقارت سے دیکھا البتہ صالح اور پاکیزہ ذریعہ معاش لائق اِعتنا اور باعث شرف تصور کیے جاتے تھے۔

مستقل مزاجی اور نیک نیتی دو ایسے عناصر ہیں جن کی بدولت اِنسان ناداری تو کیا دُنیا کے تمام تر اِنسانی مسائل سے نمٹ سکتا ہے۔ خطہ کے افراد مذکورہ اوصاف سے متصف تھے لہٰذا پروردگار عالم کی رحمتوں کے سایے اُن کے سروں پر تھے۔ خطہ کی نازک مزاجی اور بے نیازی ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ علاقہ کی خودداری کا اندازہ تو اِسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ افرادِ علاقہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ تنی حس ایسی کہ یگانہ روزگار تھے۔ اِنکساری ایسی کہ قارون کا خزانہ بھی ایمانی قوت میں جنبش پیدا نہ کرسکتا تھا۔ نوکری

دہلی کا بلیماران

حویلی مرزا غالب

تو بجائے خود عمل ناپسندیدہ تصور کیا جاتا تھا چہ جائے کہ آقا کی ناک بھنو دیکھتے۔ فنی دسترس اولین ترجیحات نیز معاش کا بہترین و پسندیدہ ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔

علاقہ کی شہرت دراصل وہاں کی صنعتی کاریگری مثلاً زردوزی، چکن سازی، رفوگری، کامدانی، تارکشی، رنگ ریزی، سلما و گوٹہ سازی، ورق سازی، سنگتراشی، جوتا سازی، خطاطی وغیرہ چہار دانگ عالم میں عدیم المثال کی حیثیت رکھتے تھے۔

مشاغل بلی ماران میں پتنگ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، پٹے بازی، مجمع بازی وغیرہ پسندیدۂ عام و خاص تھے۔

دورِ حاضر نے جہاں دیرینہ تہذیب کو مسخ کر کے رکھ دیا وہیں علاقوں کے ناموں کو بھی حالات کی نظر لگ گئی۔ بلی ماران کی یہ تو خوش قسمتی ہی تصور کی جائے کہ آج بھی اُسی نام سے باقی ہے ورنہ پرانی دہلی کے بعض محلے اپنی تہذیب کے ساتھ ہی درگور کر دیئے گئے۔ اب اُن کا تذکرہ محض کتب قدیمہ میں ہی مل سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک محلّہ ''محلّہ سہاگ پورہ'' ہوا کرتا تھا۔ محلّہ میں سلاطین کی بیوائیں اور خواصیں رہا کرتی تھیں۔ ''محلّہ کھکھیڑیان'' جس میں مرزا عبدالقادر دہلوی رہا کرتے تھے، کالی پہاڑی سے متصل تھا۔

بلی ماران نے اپنی دیرینہ خصوصیات کا تحفظ ہی نہیں اُس کے فروغ کی ہر ممکنہ کاوشیں بھی کی ہیں۔ نتیجتاً آج بھی اُس کے آثار بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

محلّہ میں بہت سے امیر اپنی خصوصیاتِ امارت، پیادہ و سوار فوج کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خاندانِ شاہی کے ایسے سیکڑوں افراد سکونت پذیر تھے جن کی اپنی جاگیریں و وظیفے تھے۔ ستم ظریفی تو یہ کہ شاید ہی کوئی خاص مستقل مزاج رہا ہو۔ ایک دوسرے کو زیر کرنے کا جذبہ بہت عام تھا۔ لہٰذا، ہزاروں روپئے آب دریا کی طرح بہا دیئے جاتے۔ حد تو یہ کہ کم و بیش نوے فیصد سلاطین اور اہل بلی ماران صاحبانِ تخلص تھے۔ شاعری کا ایسا چرچا کہ بیشتر صاحب دیوان بھی تھے۔ بہانہ ہاتھ لگا کہ مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ بلی ماران کے ماہانہ مشاعروں کی بات ہی نرالی تھی۔ مرزا غالب، میر تقی میر، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، قدرت اللہ قاسم، قائم چاند پوری، اِنعام اللہ خاں یقین اور نہ جانے کتنے باکمال شعرا داد و دہش کے حق دار قرار پاتے۔ مبالغہ کی حد تک داد و تحسین کا تصور تھا۔

علاقہ اپنی کشاکش کے نقطۂ نظر سے ہر دور میں منفرد شناخت کا حامل رہا ہے۔ ایسی شخصیات بھی رہی ہیں جو محتاجِ تعارف نہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، جناب حکیم اجمل خاں (ہندوستانی دواخانہ)، جناب حکیم احسن اللہ خاں، جناب حکیم شریف، مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا محمد عثمان فارقلیط، جناب آفتاب احمد صدیقی، جناب شاہد صدیقی، جناب ف۔س۔ اعجاز، جناب ہارون یوسف، مولانا حبیب الرحمٰن الاحرار، جناب عزیز الرحمٰن، بیرسٹر سلطان یار خان، ڈاکٹر مولانا محمد فاروق واصفی نقشبندی، مجددی، دہلوی (مسلم مسافر خانہ)، جناب محمد شفیع گھڑی والے، جناب سلام ٹوپی والے، جناب نسیم بٹن والے، جناب محمد اِلیاس، جنرل مرچنٹ، جناب فیروز احمد، گھنٹہ گھر، حلواسوہن والے، جناب غلام محمد ملک جوتے والے، مولانا سید احمد ہاشمی، مولانا حفظ الرحمٰن، حکیم ذکی، حنیف دودھ والے وغیرہ سے کون واقف نہیں۔

بلی ماران علاقہ میں ایک نامی گرامی ہوٹل ''بسم اللہ ریسٹورنٹ'' بھی ہوا کرتا تھا۔ مذکورہ ریسٹورنٹ میں میں شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ بلاتفریق ملک وملت افغانی و دیگر اہل ذوق اشخاص چائے کے ساتھ شعر و شاعری سے بھی محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ریسٹورنٹ کا قیام 1940 میں ہوا۔ اِس کے پروپرائٹر محمد فرید اور محمد ظہیر ہوا کرتے تھے۔ بالآخر چچازاد بھائیوں کی آپسی ناچاقی کے سبب ریسٹورنٹ کو بند جیسے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ گلی کے والی کا حلوہ بھی شانِ امتیازی رکھتا تھا۔ اِسی طرح سے محلّہ بارہ دری شیر افگن میں ورق کوٹنے والوں کی ایک دُکان بھی ہوا کرتی تھی جو ہرن کی جلد کے درمیان چاندی کے ورق کوٹتے تھے۔ ہاں، ورق کی ایک دُکان گلی قاسم جان کے بیچوں بیچ ریکسین کی دُکان ''گنگارام گردیال سنگھ'' کے برابر بھی ہوا کرتی تھی جس کی ٹکاٹک کی آواز آج بھی راقم کے کانوں میں گونجتی ہے۔

بلی ماران میں ہی پھاٹک پنجابیان یا پنجابی پھاٹک میں ایک گلی جامن والی ہوا کرتی تھی جو آج بھی ہے۔ غالباً یہی گلی یا اس سے اگلی گلی بازار لال کنواں کی گلی چابک سواران سے مل جاتی تھی۔ اسی گلی میں آج کے معروف و معتبر مصنف ماہنامہ ''انشاء'' کے مدیر جناب ف۔س۔ اعجاز بھی قیام کرتے تھے۔[1] اپنے زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے اپنی گلی میں قائم شدہ لائبریری سے بہت سی کتابیں ایک آنہ یومیہ کرایہ پر پڑھی ہیں۔ غالباً ساٹھ کی دہائی میں اعجاز صاحب کلکتہ کو کوچ کر گئے۔ چونکہ لکھنے پڑھنے اور خاص طور سے اردو زبان سے جناب اعجاز صاحب کو قلبی لگاؤ تھا، انھوں نے کلکتہ کے اخبارات و رسائل میں تو قلم کی تگ و دو کی ہی، ہندوستان کے ادبی منظر نامہ سے بھی جڑے رہے۔ رسالہ ماہنامہ ''انشاء'' کی اشاعت کا اعجاز انھی کا ہے۔ آج کے دور میں ''انشاء'' اردو کا ایک مکمل بین الاقوامی ماہنامہ ہے جو پنجاب سے راول پنڈی، لندن سے ماسکو، ٹورنٹو اور نیویارک، آسٹریلیا سے بنگلہ دیش اور ریاض تک پڑھا جاتا ہے۔ اعجاز صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کہ وہ عالمی سطح پر اردو کے مقبول و معتبر ترین مدیران میں سے ایک ہوں۔

ایسے ہی بلی ماران میں حنیف بھائی دودھ والے کا دودھ پوری دِلّی میں مشہور تھا۔ اُن کے کچے دودھ سے ہی ایسی خوشبو نکلتی کہ مت پوچھیے، پکے دودھ کی تو بات ہی نرالی تھی۔ گائے کا خالص دودھ بیچتے اُنھیں عمر گزر گئی۔ اِسی طرح سے راقم کو یاد ہے کہ احاطہ کالے صاحب کے ٹھیک سامنے دتو قصائی کی دُکان ہوا کرتی تھی۔ نام تو غالباً کچھ اور رہا ہوگا لیکن ہم سب اُنھیں دتو کے نام سے ہی جانتے تھے۔ اِسی دُکان کے برابر ایک حجام کی دُکان بھی تھی جو آج بھی موجود ہے اور مالک کی چوتھی نسل یہاں اپنا فرض انجام دے رہی ہے۔ اِس کے برابر ہی اِلیاس بھائی اور بھائی خلو کی جنرل مرچنٹ کی دُکان پر اُن کے بزرگ والد نورانی ساچہرہ اور سفید داڑھی کے ساتھ ٹین کے ڈبوں میں پاپے اور ٹکیاں وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ اب نہ اِلیاس بھائی کے والد رہے اور نہ ہی اُن کے دوسرے بھائی خلو۔ اِسی پھاٹک پر بائیں جانب ایک بزرگ رسیدہ بڑے میاں چنے، مٹر، مُرمُرے، کھیلیں، چورن، اِملی، لاٹری، چھوٹے موٹے کھلونے، لٹو وغیرہ فروخت

---

[1] حویلی حسام الدین حیدر، پھاٹک پنجابیان میں گلی محل سرائے کے صدر داخلے کے سامنے والا کسٹوڈین کا مکان 1337 نمبر تھا۔ اِس میں ہم رہتے تھے۔ میں 1958 میں کلکتہ منتقل ہوا۔ لیکن میری شادی میری والدہ کے انتقال کے بعد 3 جون 1973 کو دہلی کے اسی مکان سے ہوئی۔ ہمارا ایک اپنا مکان وہیں چھوٹی کھڑکی سے متصل — 1014 گلی چابک سواران میں تھا۔ بعد میں ابّا نے ایک پرانا مکان لال کنواں میں ہمدرد دواخانے کے سامنے کا جس میں پوسٹ آفس واقع تھا بھی خرید لیا تھا۔ لیکن بعض اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی جائداد اب نہیں بچی۔ پھاٹک پنجابیان والے گھر کے پاس کی لال مسجد میں میں نے اردو قاعدہ اور نماز پڑھنی شروع کی اور فتحپوری مسلم اسکول میں چند ماہ چوتھی کلاس کی تعلیم پائی۔ استاد شاعر حضرت مشیر جھنجھانوی مرحوم بھی وہاں پڑھاتے تھے۔
اعجاز

کرتے تھے۔ ہم تین پیسے سے لے کر دو آنے تک کا سودا اُن سے خرید لیا کرتے تھے۔ اِسی پھاٹک پر کونے میں ''پیکارڈ واچ کمپنی'' کا گیراج تھا۔ یہ محلّہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ غالباً اُن کے پاس 1950 سے ہی امبیسڈر گاڑی ہوا کرتی تھی؏۔ گیراج کے برابر اوی نام کے پنساری کی دُکان تھی۔ غالباً اُن کا نام اوم پرکاش رہا ہوگا۔ بلّی ماران میں بادشاہ مٹھائی والے کا جواب نہیں تھا۔ اُن کا دن صبح صبح پھولی پھولی کچوریوں، آلو کی سبزی اور حلوہ مٹھری سے شروع ہوتا تھا۔ کچوری اِتنی لذیذ ہوتی کہ دُور دُور سے لوگ خریدنے آتے اور ایک اژدہام دُکان کے آگے کھڑا پکار لگاتا رہتا۔ دس کچوری، بیس کچوری، تین کچوری وغیرہ۔ اِن کا صبح کا حلوہ نہایت ہی خوش بودار اور لذیذ ہوتا تھا۔ غالباً ایک آنے کی دو مٹھری آتی تھی جس میں وہ کھرچی سے ذرا سا حلوہ مٹھری کو پھوڑ کر گھُمو دیتے۔ واقعی ناشتے کا مزہ آجاتا اور ہاں، جب ناشتے کی بات چل ہی رہی ہے تو بڑی ناانصافی ہوگی اگر ہم دُنیا کی بہترین یعنی ''بسم اللہ ہوٹل'' کی نہاری کا ذکر نہ کریں۔ نہاری کیا تھی من و سلویٰ تھی۔ رات بھر سولہ مسالوں کے ساتھ ہلکی آنچ پر تیار کی جاتی تھی۔ اِس کو کھا کر ایسا محسوس ہوتا کہ مانو کمزور جسم میں بجلی کی سی تیزی آگئی ہو۔

صنعتی اِنقلاب کے زیرِ سایہ طباعتی اِرتقا سے بھی علاقہ محروم نہ تھا۔ چھاپے خانے تو کئی ہوا کرتے تھے لیکن جیّد پرنٹنگ پریس کافی مشہور تھا۔ میدانِ اِشاعت و طباعت میں صدیقی خاندان فرد فرید تھا۔ گراں قدر ہستی حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی نے 1953 میں روزنامہ ''نئی دُنیا'' شائع کر کے شاہراہِ اُردو صحافت میں سنگِ میل قائم کیا۔ نئی دُنیا کا کوئی مدِّمقابل تھا تو وہ حافظ یوسف دہلوی و فرزندان یونس اور اِدریس اور الیاس دہلوی تھے مگر حقیقت تو یہی ہے کہ ماہنامہ ''کھلونا''، ماہنامہ ''شمع'' و ماہنامہ ''بانو'' اور نئی دُنیا کی راہیں جداگانہ تھیں۔ مذکورہ حقائق کے پس منظر میں علاقہ بلّی ماران اُردو ادب و تہذیب کا مظہر اور مینارۂ روشن تھا۔

مولانا پیدائشی کانگریسی تھے۔ وطن پرستی کا جذبہ رگوں میں خون بن کر گردش کرتا تھا۔ ''نئی دُنیا'' کی اِشاعت اُن کے عمل پیہم اور عزم و اِستقلال کا مظہر تھا۔ کیا کیجیے، ہر دور میں غیر سماجی عناصر ہوا کرتے ہیں، تو اُن کے کام میں رخنہ ڈالنے کی پوری پوری کوششیں کیوں نہ ہوتیں۔ مولانا کے قدر دانوں میں راجندر بابو سے لے کر پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل تک تھے۔ میدانِ صحافت میں مولانا کی کارکردگیاں ایسی تھیں کہ ایوانِ اعلیٰ وزیریں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ سیاسی عہدے تو اُن کے قدموں میں پڑے تھے لیکن اُن کی شانِ بے نیازی دیکھیے، کبھی وہ خاطر میں نہ لائے۔ اُسی خونِ جگر کا صلہ ہے کہ اخبار ہنوز اپنی تمام تر کامیابیوں کے ساتھ جاری ہے۔ مولانا کے فرزند جناب شاہد صدیقی واقعی اُن کے قلمی وارث ہیں۔

شاہد صاحب یوں تو کانگریس، بی۔ ایس۔ پی۔، ایس۔ پی۔ وغیرہ سیاسی پارٹیوں سے منسلک رہے مگر اُردو صحافت کو مطلب براری کا وسیلہ نہیں بنایا۔ میدانِ سیاست میں والدِ محترم کے نظریہ پر کاربند ہو کر محض سماجی خدمات ہی اُن کے اوّلین مقاصد ہیں۔

شاہد صاحب کی رہائش بلّی ماران کی حویلی حسام الدین حیدر (پھاٹک پنجابیان) میں ہوا کرتی تھی۔ صحافت سے اُنھیں ذہنی مناسبت ہے۔ اُن کے خصوصیاتِ منفردہ کے مدِّنظر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ پیدائشی وارثِ قلم اور خطابت اُن کا پیرہن نیز قرآن وسنت مشعلِ راہ ہے۔ دلچسپ بات تو یہ کہ اُن کی پیدائش بھی دفترِ اخبار میں ہوئی تھی۔

مذکورہ محلّہ کی دیگر قد آور ہستی آفتاب احمد صدیقی کی تھی۔ وہ نادرن ریلوے مینس یونین کے صدر تھے۔ اُنھوں نے تعلیم دارالعلوم دیوبند و دیگر دانش گاہوں مثلاً پنجاب، بھٹنڈا اور لاہور کی یونیورسٹیوں وغیرہ سے حاصل کی۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ راقم کے صدیقی صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ واقعتاً وہ اِسم بامسمّیٰ تھے۔ اُن کی پیدائش سرزمین اکابرین و عمائدین مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی و حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، میں ہوئی۔ حضرت مولانا یعقوب نانوتوی نے مردانہ وار سامراجی طاقتوں کا مقابلہ کر کے آزادیٔ ہند کے لیے راہیں اُستوار کیں۔ صدیقی صاحب زبانی جمع خرچ کے بجائے عملی سرگرمیوں میں یقین رکھتے تھے۔ عملی سرگرمیوں میں اِنہماک کا اندازہ تو اِسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ 8 سے 20 گھنٹے تک مصروف رہا کرتے تھے۔ اُنھیں برادرانِ ملت سے والہانہ ہمدردی تھی لہٰذا، اُنھوں نے اُن کی فلاح کے لیے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ دسیوں لوگوں کو اُنھوں نے ہندوستانی ریلوے میں ملازمت سے ہمکنار کرایا۔

دورانِ صدارت اُنھوں نے ریلوے سے منسلک قلیوں، خوانچہ وچائے اور اخبار فروشوں وغیرہ کو منظم کر کے اُن کے پامال شدہ حقوق کی بازیابی کرائی۔ جذبہ ملّی خیر خواہی کے تحت اُنھوں نے راقم سمیت چند نوجوانوں، محمد اطیب صدیقی، اِقبال محمد ملک وغیرہ پر مشتمل ایک پلیٹ فارم کے ذریعہ نوجوانوں میں جذبہ تحفظِ ملّی مفادات کو فروغ دینے کی حتی المقدور سعی کی۔

جذبہ حب الوطنی سے متعلق ایک دلچسپ حقیقت یہ کہ دورانِ مباحثہ ہندوستانی ریلوے کے کسی آفیسر اعلیٰ نے صدیقی صاحب کو ''پاکستانی ایجنٹ'' کہہ دیا۔ صدیقی صاحب جیسے وطن پرست اور مستقل مزاج شخص کی بھی اپنی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ نتیجتاً اُس کا ردِّعمل بالکل اُسی انداز میں ظاہر کیا جیسا کوئی بھی ذی شعور ہندوستانی کرتا۔ اُنھوں نے اپنے پیر سے جوتا نکالا اور غیر ذمہ دار آفیسر کے گال پر رسید کر دیا۔

بہر حال، ایسا شخص جس نے ساری زندگی وطن اور برادرانِ وطن پر نچھاور کر دی، وہ خود کو کس طرح پاکستانی ایجنٹ سُننا برداشت کرتا۔ مذکورہ ردِّعمل آفتاب صاحب کو کافی مہنگا پڑا۔ اُنھیں فوری طور پر نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ مذکورہ واقعہ سے متعلق ایوان میں بھی سوالات اُٹھائے گئے۔ حیرانی کی بات تو یہ کہ صدیقی صاحب کی حمایت مسلمانوں کی جانب سے نہیں بلکہ ہمارے برادرانِ وطن کی طرف سے ہوئی۔ نہ صرف مزدور بلکہ رہنمایانِ وقت، اِندرا گاندھی اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خان صدیقی صاحب کے شانہ بہ شانہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صداقت کی فتح ہوئی ہے لہٰذا، متعلقہ آفیسر کو نہ صرف معافی طلبی بلکہ اُسے تبادلہ کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

مذکورہ شخصیات کی مانند دیگر ہستیاں بھی ہیں لیکن طوالت کی بنا پر صرف نظر کیا جاتا ہے۔

(راقم مولانا آزادؒ کے پوتے ہیں) ●●

؏ جہاں تک مجھے دھیان ہے ایمبیسڈر گاڑی بنگال کے ضلع ہگلی میں برلا نے ہند موٹرس میں تقریباً 1955 میں تیار کی۔ اس سے قبل لینڈ ماسٹر نام کی بڑی مضبوط کار متعارف ہوئی تھی جس کے لئے انجن، باڈی اور کئی دیگر سامان برطانیہ سے امپورٹ کئے جاتے تھے۔ ہند موٹرس اب بالکل زوال پر ہے۔ اتفاق ہے کہ میری فرم گولڈن انجینئرنگ کارپوریشن 1975 سے تاحال ایمبیسڈر کار کے لئے Rivet [ریوٹ] سپلائر ہے۔
اعجاز

ڈاکٹر شباب للت
B-186, Sector - 3
New Shimla - 171009

تیرے خطوط

گھٹتا ہے جی مرا تیری فرقت میں جب کبھی
ہوتا ہوں بے قرار غمِ جاں گداز سے
مجھ کو پکارتے ہیں ترے کیف اثر خطوط
تیرے سنگار میز کی دلکش دراز سے

تیرے قلم کی نوک سے ابھرے تھے جو حروف
اُن میں ہے اک وفاؤں کی دُنیا بسی ہوئی
اُن میں گھلا ہوا تیرے اخلاص کا ہے رنگ
ان میں ہے تیرے پیار کی خوشبو رچی ہوئی

بکھرے ہوئے ہیں تیرے دل آرا خطوط میں
کومل سے تیرے دل کے وہ جذبات رنگ رنگ
بے تابیٔ فراق کی رودادِ غم اثر
راز و نیازِ شوق، ملاقات کی امنگ

شکوے وہ بے وفائی کے مجھ سے کہیں کہیں
باتیں قلم پہ لاگ کی ، دل میں لگاؤ کی
قسمیں کہیں کہ تم سے نہ بولوں گی عمر بھر
ترکِ وفا کا عذر ، لگن دل میں چاؤ کی

کالج سے تونے لکھے جو مکتوبِ دل نواز
دینِ وفا کے ہیں وہ صحیفے مرے لئے
اک جلوہ گاہِ شوق ہے اُن کا ورق ورق
روشن ہیں ان سے غم کدۂ روح میں دیئے

میکے سے گاہ گاہ لکھے تو نے جو خطوط
کتنا خلوص ان سے چھلکتا ہے الاماں
تشویش بے حساب وہ تنہائی پہ مری
ہر جملے میں ہزار دعاؤں کے کارواں

ہر چند راہِ شوق میں اک سخت موڑ پر
ناگاہ جانِ شوق! تو گم ہوگئی کہیں
پھر بھی ترے خطوط سے حاصل ہے تیرا قرب
تو مجھ سے دور ہے مرا دل مانتا نہیں

ساگر ہے ایک پیار کا تیرے خطوط میں
ملتی ہے جس میں ڈوب کے دل کو شگفتگی
میں غم کو بھول جاتا ہوں کچھ دیر کے لئے
ہونٹوں پہ لوٹ آتے ہیں نغماتِ سر خوشی

دل میں اداسیوں کا بسیرا ہے آج پھر
احساسِ بے کسی ہے پریشاں کئے ہوئے
"پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے" [غالب]

تیرے خطوط ' ہیں تیری رنگیں نوازشات
تازہ ہے ان کے دم سے مرے دل کی واردات
تو تو چلی گئی ہے چھڑا کر حسین ہات
تیرے خطوط ہیں مرا سرمایۂ حیات

ظفر عزیز (اچلپوری)
کٹنی لیڈر شاپ
مشن چوک۔ کٹنی۔483501

ساعتوں پہ ابھی خوف کا بسیرا ہے
یہاں نہ بین بجاؤ یہ شہر بہرہ ہے

قلم اٹھاؤ مرتب کرو نئی تاریخ
مورخو یہ مرا دور بھی سنہرا ہے

میں اپنی سوچ کو بدلوں تو اپنی فکر بدل
پھر اس کے بعد ترا درد درد میرا ہے

حقیقتوں سے کہاں تک بچاؤ گے دامن
ہزار آئینے بدلو پر ایک چہرہ ہے

بس اس امید پہ تسکین پا رہے ہیں لوگ
طویل رات کے آگے بھی اک سویرا ہے

ادب سکھاؤ نہ یارو ادب نوازوں کو
وہاں چراغ جلاؤ جہاں اندھیرا ہے

کمال جعفری
C/o. Irfan Ahmad
R-282, St.No.7, Zakir Nagar
Okhla, New Delhi-110025

رُخ کو آئینہ ملے زُلف کو شانہ مل جائے
میرے ہونٹوں کو تبسم کا ترانہ مل جائے

گھر سے نکلوں جو سرِ راہ گذر اے ہمدم !
تجھ سے ملنے کا مجھے کوئی بہانہ مل جائے

بھوک کا اور نہ افلاس کا ہوگا احساس
وہ پرندہ کہ جسے وقت پہ دانہ مل جائے

جس وراثت پہ کروں ناز زمانے بھر میں
علم و حکمت کا وہ انمول خزانہ مل جائے

زد میں لا سکتا ہے کتنے ہی ستم گاروں کو
گر مرے تیر کو بھرپور نشانہ مل جائے

منزلِ شوق جو مل جائے کبھی رستے میں
خیر مقدم کو مرے ایک زمانہ مل جائے

اب زمیں پر ہے کمالؔ اپنی گھٹن کا ماحول
کاش ! رہنے کو کہیں اور ٹھکانہ مل جائے

ف۔س۔اعجاز

یوم ویلنٹائن

فروری میں 28 دن کیوں ہوتے ہیں؟

ایک قدیم روایت کے مطابق جولائی کا نام جولیس سیزر کے نام پر رکھا گیا۔اس لئے اس مہینے میں 31 دن ہوئے ۔بعد میں جب آگسٹس سیزر سلطنت روم کا بادشاہ بنا اس نے چاہا کہ اگست کا مہینہ اس کے نام پر ہو اور اس میں بھی 31 دن ہوں ۔لہٰذا دو زائد دن فروری مہینے سے نکال لئے گئے اور فروری 28 دنوں کا رہ گیا۔

البتہ بعض مورخ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے ۔ان کا عقیدہ ہے کہ بادشاہ Numa Pompilius کے زمانے ہی سے فروری 28 دن کا چلا آرہا ہے۔اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک سال بارہ قمری گردشوں کے برابر ہو اور 355 ایام پر مشتمل ہو ۔تب جفت (Even) ہندسے مبارک تصور نہیں کئے جاتے تھے اِس لئے اُس نے سات مہینے 29 دنوں کے بنائے اور چار مہینے 31 دنوں کے ۔اس طرح کل 327 ہوئے ۔ اب اسے ایک چھوٹا مہینہ جفت اعداد کا مطلوب تھا۔ فروری کا مہینہ اسے نسبتاً کم پسند تھا کہ وہ جاڑوں کے بیچ میں آتا تھا۔لہٰذا اس نے فروری کو 28 دن دیدئے۔اور 355 دنوں کا سال بنادیا۔ ●●

♥ ویلنٹائن ایک رومن راہب تھا۔ کلاوڈیس کے زمانے میں 269ء کے قریب وہ شہید کر کے فلیمین وے (Flemian Way) میں دفنایا گیا۔اس نے ظلم اور ایذا رسانی کے دور میں عیسائیوں کی مدد کی اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ۔تب وہ عیسائی ہو گیا اور اس کی پاداش میں 14 فروری 269ء کو قتل کر دیا گیا۔ حکایت میں ہے کہ جب وہ جیل میں تھا تو اس نے دوستوں کو پیغامات روانہ کئے کہ ''اپنے ویلنٹائن کو یاد رکھو'' اور ''میں تمہیں پیار کرتا ہوں''۔

♥ ایک اور داستان میں ہے کہ ویلنٹائن ایک پادری تھا جو خفیہ طور پر جوڑوں کی شادی کروا کے روم کے بادشاہ کلاوڈیس کی خلاف ورزی کرتا تھا جو عارضی اور مذہب سے ممنوعہ شادیوں کا عادی تھا۔

♥ ویلنٹائن کو ملحدوں کے دیوتاؤں کی عبادت کرنے سے انکار کرنے پر قید کر لیا گیا۔ جیلر کی بیمار بیٹی سے دوستی کر کے اس نے اپنی عبادت کے ذریعہ اس کا علاج کر دیا۔کہا جاتا ہے کہ اپنی پھانسی کے دن 14 فروری کو اس نے ایک رُقعہ تحریر کیا جس کے نیچے درج تھا ''تمہارا ویلنٹائن''۔

💔 ایک اور کہانی ہے کہ ویلنٹائن تیرنی کا پادری تھا جو روم میں شہید کر دیا گیا۔

💔 عہد متوسط میں ایک عقیدہ تھا کہ پرندے 14 فروری کو اختلاط شروع کرتے ہیں۔اس خیال کے تحت اس روز سے محبت کے خطوط کارڈ کی شکل میں روانہ کرنے کی روایت شروع ہوگئی۔ پندرہویں صدی میں یوروپ میں گائے جانے والے ویلنٹائنوں کو آہستہ آہستہ مکتوبات سے بدل دیا گیا۔ پہلے تحریری ویلینٹائن کا سہرا ڈیوک آف اورلینز چارلس کے سر بندھتا ہے جس نے اپنی بیوی کے نام عشقیہ نظمیں لکھیں جبکہ 1415ء میں وہ زنداں میں قید تھا۔سولہویں صدی کے آغاز میں ویلنٹائن پیغامات صرف تحریری روانہ کرنے کا رواج ہوگیا۔

💔 ابتدائی ویلنٹائن نامے ہاتھ سے بنے ہوئے رنگین کاغذ پر تھے۔اکثر وہ آبی رنگوں اور روشنائیوں سے ہلکے شیڈز میں تیار کئے جاتے تھے۔

💔 رچرڈ کیڈبری نے 1800ء کے بعد یوم ویلنٹائن کا پہلا کینڈی بکس ایجاد کیا۔

💔 ویلنٹائن ڈے پر پھول خریدنے والوں میں 73 فیصد مرد ہوتے ہیں اور صرف 27 فیصد خواتین اس دن پھول خریدتی ہیں۔

💔 عہد متوسط میں نوجوان مرد اور عورتیں ایک پیالے میں سے نام کی چٹ نکال کر دیکھنا پسند کرتے تھے کہ ان کے ویلنٹائن کون ہوں گے۔پھر وہ ایک ہفتے تک اس نام کو اپنی آستین پر پہنے رہتے تھے۔آج اپنے محبوب کا نام اپنی آستین پر تحریر کر کے پہننے سے لوگوں کو یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ آپ فلاں نام کے ساتھ کیا کیا محسوس کرتے ہیں۔

💔 1537ء تک سینٹ ویلنٹائن ڈے کی سرکاری چھٹی کا اعلان نہیں ہوا تھا۔لیکن انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم (VIII) نے 14 فروری کو چھٹی کا دن قرار دیا۔ایک واحد تر و تازہ سرخ گلاب کو ایک معصوم نوزائیدہ بچے کی مسکراہٹ کے ساتھ بعض گلفروش ایک ''دستخط گلاب'' کا نام دیتے ہیں اور اسے یوم ویلنٹائن یا رسم سالگرہ یا پیدائش کے دن بہت اچھا تحفہ تصور کیا جاتا ہے۔

💔 بعض لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اگر ویلنٹائن ڈے پر کوئی لڑکی اپنے سر پر روبن کو اُڑتا دیکھے تو اس کی شادی کسی جہازی سے ہوسکتی ہے۔اور اگر اُس روز ابابیل دیکھے تو اس کی شادی کسی غریب سے ہوگی جس کے ساتھ وہ خوش رہے گی۔

💔 17ویں صدی میں ایک خیال کے مطابق اگر ایک کنواری لڑکی نے 14 فروری کی شب کو ایک سخت ابلا ہوا انڈا کھایا اور اپنے تکیے سے Bay جھاڑی کے پانچ پتے انکا کر اس پر سر رکھ کر سو جائے تو وہ خواب میں اپنے ہونے والے شوہر کی صورت دیکھ لے گی۔

💔 قدیم رومیوں میں جونو (Juno) کے اعزاز میں 14 فروری کو لیوپر کیلیا کا جشن منانے کی رسم تھی۔جونو رومن دیوتاؤں اور دیویوں کی ملکہ تھی۔اور وہ خواتین اور شادی کی دیوی بھی تھی۔

💔 دل رومان انگیز محبت کا سب سے عام استعارہ ہے۔دل محبت سے اس لئے جڑا ہوا کہا جا سکتا ہے کہ قدیم یونانیوں کے خیال میں وہ ایروس جسے روم کے لوگ کیوپڈ کے نام سے جانتے ہیں، کا ہدف تھا۔کیوپڈ کا تیر جس کسی کے دل کو نشانہ بنالیتا اسے محبت میں مبتلا کر کے چھوڑتا کیونکہ دل محبت سے پیوست ہوتا ہے۔اس کا سرخ رنگ انتہائی رومانی سمجھا جاتا ہے۔

💔 اٹلی کا شہر ویرونا جہاں شیکسپیئر کے محبوب رومیو اور جولیٹ رہا کرتے تھے ہر ویلنٹائن ڈے پر جولیٹ کے نام تقریباً ایک ہزار خطوط وصول کرتا ہے۔

💔 محبت کا سب سے مثالی تحفہ ہندوستان کا تاج محل ہے جسے مغل حکمراں شاہجہاں نے اپنی بیوی ممتاز کی یاد میں تعمیر کروایا تھا جو چودھویں بچے کی ولادت میں مرگئی تھی۔تاج محل کی تعمیر 1634 میں شروع ہوئی اور تقریباً 22 سال تک ہوتی رہی۔یہ کام پورے ہندوستان اور وسطی ایشیا کے بیس ہزار کاریگروں نے پورا کیا۔

💔 سب سے پرانا ویلنٹائن پیغام بتایا جاتا ہے کہ، ڈیوک آف اورلینز نے 1415ء میں اپنی فرانسیسی بیوی کو بھیجا تھا، جب وہ مینار لندن میں قید تھا۔یہ پیغام آج بھی برطانیہ کے ایک میوزیم میں نمائش کے لئے رکھا ہوا ہے۔

💔 سب سے قدیم عشقیہ نظم مٹی کی تختی پر لکھی گئی تھی۔یہ Sumerian عہد کی بات ہے۔سمیرینوں نے ہی 3500 ق مسیح میں تحریر ایجاد کی تھی۔جن ماہرین آثار قدیمہ نے اسے دریافت کیا انہوں نے اسے ''# استنبول 2461'' کا غیر رومانی نام دیا۔ ●●

نذرِ ایران (قطعات)

(ہند و ایران کی تہذیبی رشتگی اور ایران کی مغربی استعماریت کے خلاف سخت موقف کی نذر)

بھرا ہے جن سے ہمارا خزینۂ اردو
ہزار لعل و گہر فارسی زبان کے ہیں
چمن میں دہلی و لکھنؤ کے مسکراتے ہوئے
یہ پھول مشہد و شیراز و اصفہان کے ہیں

کمالِ فکر و تصوف ، جمالِ شعر و ادب
ہزار گونہ روابط ہیں ہند و ایراں کے
اب ایک رابطۂ حریت بھی ہو قائم
خلاف سطوتِ صیہونیت پرستاں کے

نہ ہم سے جیت سکیں گے وہ بل پہ طاقت کے
کہ حرفِ حق ہے بہت مرگِ افترا کے لئے
ہماری جنگ ہے ہر ظلم ، ہر تشدد سے
جہاں میں امن کی، تہذیب کی بقا کے لئے

بچھی ہوئی ہے بساطِ سیاست عالم
اُمید فتح بس اسلامی اتحاد سے ہے
اٹل رہیں اُسی موقف پہ ہم کہ جو قائم
خمینی ، خامنہ ای ، احمدی نژاد سے ہے

نہ ٹک سکے گی عرب میں بھی آمریت اب
نئے ارادے ، نئے عزم ہیں مسلماں کے
یمن ہو، ترکی و تیونس کہ مصر و اردن و شام
نکل پڑے ہیں نقوشِ قدم پہ ایراں کے

عبدالاحد ساز
C/o Md. Haji Adam & Co.
84, Chakla Street
Mumbai - 400003

لیبیا --- ۲۰۱۱ء

کوئی جواز نہ تھا لیبیا پہ حملے کا:

فقط عوام کی مظلومیت بہانہ ہے
وگرنہ عالم ِسلام ہی نشانہ ہے
نقابِ عدل میں چہرہ ہے حاکیت کا
بھرا ہے سوانگ لٹیروں نے پھر قیادت کا
بنام نصرتِ جمہوریت جو شورش ہے
تمام مغرب و صیہونیت کی سازش ہے

نئی ہے چال، پرانی بساط کھیل کی ہے
اور اب کی بارہوس لیبیا کے تیل کی ہے

نذیر فتح پوری ۔ مدیر ''اسباق''۔ پونہ

یہ کیسے موڑ پہ اپنا سفر نکل آیا
جہاں سے گزرے، وہیں پر خطر نکل آیا
ابھی اڑان کی خواہش ہی دل میں جاگی تھی
شکاری جال اٹھائے اِدھر نکل آیا
دعا نے ہاتھ اٹھائے تھے دھوپ سے ڈر کر
خدا کا شکر، وہیں اک شجر نکل آیا
جہاں گری تھیں ہمارے لہو سے کچھ بوندیں
اسی زمین سے اک دیدہ ور نکل آیا
جنوں میں پھونکنے جس کو چلے ہو، سوچو تو
کہیں تمہارا ہی اپنا جو گھر نکل آیا
نذیر اپنے لہو سے جو پیڑ سینچا تھا
ہمارے حق میں وہی بے ثمر نکل آیا

محمود شام

شہید معمر قذافی

تیرے لہو سے بڑھ گئی صحرا کی آبرو
ذہنوں میں نقش ہوگیا ہے تیرا سرخ رو
دنیا میں تیرا عزم ہے موضوعِ گفتگو
خاکِ وطن سے عہد نبھا کر گیا ہے تو

زندہ تھا تیری آن سبھی دیکھتے رہے
انسانیت کی شان سبھی دیکھتے رہے
جاتی ہے کیسے جان سبھی دیکھتے رہے
دھرتی اور آسمان سبھی دیکھتے رہے

بدمست اہلِ غرب ہیں، نشے میں چور ہیں
تہذیب، امن، آگہی، سب سے ہی دور ہیں
دعوئ ہے اپنے عہد کا ہم ہی شعور ہیں
چنگیزیت کا اصل میں پھر سے ظہور ہیں

تاریخ شرمسار ہے، احساس اشکبار
اقدار زخم زخم ہیں، جذبات بے قرار
جغرافیہ لہو لہو، افکار سوگوار
جمہوریت کے نام پر اسلام کا شکار

مرحومہ بہن شیریں تاج کی نذر دو نظمیں

رزّاق افسر
3913, BAZM-E-URDU
Hyder Ali Road
Lashkar Mohalla
MYSORE-570007

پیدائش: 1944
وفات: اتوار 2 اکتوبر 2011ء
ذیقعدہ: ۱۴۳۲ھ۔ تدفین: ۳ر اکتوبر

(۱)

اللہ اللہ
یہ داغِ ابد کی سونی کیفیت
بیاں ہو تو کیسے
جس کی چبھن
ہم سب کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے
جس کی کسک
چہرے چہرے سے عیاں ہے
جس کے بوجھ سے سر جھکے ہوئے
ہر گویائی گم سم
ہر طرف اٹوٹ خموشی
قدم بوجھل
یہ مغموم کارواں
بہت دور تک چلتے چلتے
راستے کے موڑ پر
بکھرا پڑا جس کا چہرہ
جدھر اُٹھا وہ اُدھر چل دیا
ہر سڑک سنسان
میں غم کا مارا
یکہ و تنہا کھڑا
راستوں کو تکتا رہا
آخرش تھک ہار کر
سخت مایوسی سے دوچار،
بوجھل قدموں سے
یہ کہتے ہوئے
گھر کی طرف چل پڑا
کہ یہ داغِ ابد
اُسی کا دیا ہوا ہے جس نے کل
زندگی کی شمع روشن کی تھی
یا اللہ
تیری شان جلِّ جلالہٗ
تیری شان جلِّ جلالہٗ

(۲)

صبح و شام
ایک ہی غم میں غلطاں
نفس نفس کی آمد و رفت
آبدیدہ اس کی کسک
زباں سے دل تک آئے
نہ لفظوں میں ڈھلے
ایک سنّاٹا
حدِ نظر تک پھیلا ہوا
جی میں آتا ہے کہ اس پیڑ سے
لپٹ کر خوب روؤں
جس کی چھاؤں میں
میرے کنبہ کا اثاثہ
ابدی نیند سو رہا ہے
زیرِ لب یہ دعا جاری ہے
"ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی"

حافظ کرناٹکی
چیئرمین، کرناٹک اردو اکیڈمی
بنگلور-560002

رباعیات

ہر بات سنو غور سے تم یزداں کی
جب سن نہیں سکتے تو سناتے کیوں ہو
کیوں کہ وہ سنا کرتا ہے ہر انساں کی
کچھ بھی کہو عادت ہے یہ نافرماں کی

جب تک تیرا سانسوں پہ ہے قابو مت بھول
یہ زیست ہمیشہ نہیں رہنے والی
موت ایک حقیقت ہے اسے تو مت بھول
اڑ جائے گی اک روز یہ خوشبو مت بھول

تعلیم سے بہتر کوئی خیرات نہیں
دولت کا ہے کیا آتی چلی جاتی ہے
سو باتوں کی یہ بات ہے اک بات نہیں
اس کو کوئی دھوکا یا کوئی گھات نہیں

جو شخص گناہوں کی چھپائے کثرت
اقرار گناہ کرکے جو کرلے توبہ
وہ کامراں ہوگا نہ کسی بھی صورت
اس فرد پہ اللہ کی ہوگی رحمت

ماں باپ کی پابندی ہے حکمت کے لئے
خود خطرے میں رہ کر وہ بچاتے ہیں تجھے
رہنے دے اسے تیری حفاظت کے لئے
رہ شکر گزار ان کا عنایت کے لئے

غصہ جو کرے دیر سے پابند ہے وہ
سمجھے گا اسے کون علامت کے بغیر
پہچان لو اس کو کہ خردمند ہے وہ
موتی کی طرح سیپ میں جب بند ہے وہ

جو رحم غریبوں پہ کیا کرتا ہے
ان کو جو حقارت کی نظر سے دیکھے
معبود سے اپنے وہ وفا کرتا ہے
بینائی وہ خود اپنی فنا کرتا ہے

آزاد رعایا ہے تو آزادی ہے
پستی ہی سے ملتا ہے بلندی کو عروج
برباد رعایا ہے تو بربادی ہے
پستی تو ہر اک دور کی شہزادی ہے

۱۸۵۷: کچھ غالب کی حمایت میں

ڈاکٹر یعقوب یاور
شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
بنارس-۲۲۱۰۰۵

(ایک)

سرزمین ہندوستان پر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط اور اس کی پیہم دست درازیوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ایک سو پچاس سالہ تقریبات کے انعقاد کا سلسلہ کیا شروع ہوا کہ اس بہانے ہمارے سب سے عظیم اور لائق صد افتخار شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی شامت ہی آگئی۔ اور مرزا غالب ہی کیا، اس عہد کے مولانا محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خاں جیسے دیگر اکابر ادبا و علما بھی، جن کی انگریزوں سے رسم و راہ تھی، ہماری ناقص اور گمراہ کن فکر کے نشانے پر آگئے۔ انگریزوں کے مظالم کے خلاف کچھ مقامی اسباب کی بنا پر چند فوجی گروہوں کی بغاوت سے شروع ہونے والی آزادی کی اس تحریک نے دیکھتے دیکھتے بدنظمی کی شکار ایک ہندوستان گیر عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور انگریزوں کے قتل عام اور دہلی پر عارضی فتح کا ذائقہ چکھنے کے بعد ایک عظیم شکست پر منتج ہوئی، جس کے بعد محض شک کی بنیاد پر متعدد اشخاص کو پھانسی کے پھندے پر جھولنا پڑا۔ اس تحریک کی آڑ لے کر، جس کا آج تک کوئی واضح مقصد تک معین نہیں کیا جا سکا ہے، کوئی انہیں غدار وطن اور انگریزوں کا چاپلوس ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو کوئی ننگ قوم و ملت، انسانیت کا دشمن اور خود غرض۔ اس طوفان بے تمیزی کے زیر اثر ہمارے کچھ ناقدین نے ان کی ادبی، سماجی اور شاعرانہ عظمت کو یکسر فراموش کر کے اس واقعے سے متعلق تفصیلات کو کچھ اس طرح پیش کرنا شروع کر دیا جیسے یہ اہلِ قلم نہ ہو کر صاحب سیف یا کوئی مشاق سیاست داں رہے ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ان غاصب انگریزوں کی ہندوستان پر قبضہ جمانے کی مسلسل اور شاطرانہ کوششیں قابل نفرت اور ان کے ذریعے ڈھائے جانے والے مظالم اذیت ناک رہے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پہلی مزاحمت تھی، ایک تاریخی غلطی ہی نہیں ان تمام لوگوں کی توہین بھی ہے جنہوں نے مختلف اوقات میں انگریزوں سے لوہا لینے کی کوشش کیں۔ تاریخ کے ہر صفحے پر ایسی مسلح مزاحمتوں کے واضح نقوش ثبت ہیں۔ ذرا پیچھے جائیں تو جنت نشان ہندوستان پر قابض ہونے کی لالچ کا سلسلہ سولہویں صدی میں پرتگالیوں کے ذریعے اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب واسکوڈی گاما نے کالی کٹ کی سرزمین پر اپنے قدم رکھ کر اہل یورپ کے لیے ہندوستان کے دروازے کھول دیے تھے اور رفتہ رفتہ اس کے ہم خطہ لوگوں نے ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر واقع گوا جیسے اہم تجارتی مرکز پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ یہ خبریں اور اس تسلط سے حاصل ہونے والی دولت جب یورپ پہنچی تو وہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنی تحویل میں لے کر دولت کے حصول کے منصوبے تیار کیے جانے لگے تھے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوش بدوش ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی جیسے تجارتی اداروں کا قیام عمل میں آیا جو اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے باہم معرکہ آرا بھی ہوتے رہے۔ ان میں انگریز زیادہ ذہین، شاطر اور طاقتور ثابت ہوئے اور انہوں نے جلد ہی پرتگالی، فرانسیسی اور ڈچ تاجروں کو ایک طرح سے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ انگریزوں کی مداخلت سے پہلے پرتگال کے تاجروں نے تقریباً ایک صدی تک بلا شرکت غیرے ہندوستانی سرمائے سے اپنے خزانے پُر کیے۔ انگریزوں کو اس تصادم کے ختم ہونے سے کچھ راحت ملی تو انہوں نے سارے ہندوستان کو اپنی سازشوں کے دام فریب میں پھنسانے کا آغاز کیا اور اپنی طاقت کھو بیٹھنے والے اور باہم متصادم ہندوستانی راجاؤں اور نوابوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر ان میں سے کسی ایک کی مدد کر کے معاوضے کے طور پر ان کی ریاستوں کو ہتھیانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس غاصبانہ عمل کے دوران مزاحمتیں بھی ہوئیں۔ ان میں کسانوں، سنیاسیوں اور صوفیوں کی بغاوت (۱۷۶۳ تا ۱۸۰۰ء)، شمشیر غازی کی بغاوت (۱۷۶۷ تا ۱۷۶۸ء)، وزیر علی کی بغاوت (۱۷۹۹ء)، دکن کے فوجیوں کی جزوی منظم اور مسلح بغاوت (۱۸۰۶ء)، سنگھ بھوم کے قبائلیوں کی بغاوت (۱۸۲۰-۲۱ء)، وہابی بغاوت (۶۹ تا ۱۸۳۰ء)، بندیلوں کی بغاوت (۱۸۴۲ء) جیسی متعدد مزاحمتوں کو بھلا تاریخ کیسے فراموش کر سکتی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت اور آزادی کی جنگ میں فرق کرنا اور اس فرق کی تشہیر کرنا بھی انگریزوں کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا، جس کے حصار سے ہم آج تک باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے اسے غدر کہا گیا ہو یا کچھ اور ہمارے ملک کے اندر انگریزوں کے خلاف ہونے والی ہر بغاوت اتنی ہی مقدس ہے جتنی جنگ آزادی۔ یہ صرف لفظوں کی بازی گری تھی جس میں انگریز ہندوستانیوں کو الجھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ ان حقائق کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان بغاوتوں کے باوجود یہاں کے حکمراں اور عوام انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کو نہ تو ٹھیک طرح سمجھ پائے اور نہ ہندوستان کی روز بروز کمزور پڑتی منتشر فوجی قوتیں ان کے مقابل صف آرا ہو کر کامیاب ہو سکیں۔

اصل موضوع سے جزوی گریز کرتے ہوئے ان تفصیلات کو یہاں پیش کرنے کا پہلا مقصد تو یہ واضح کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مزاحمت انگریزوں سے نجات کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ یہ کوششیں پہلے بھی جاری تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے کی تمام کوششیں بھی ۱۸۵۷ء ہی کی طرح مختلف وجوہ کی بنا پر ناکام ثابت ہوئیں۔ دوسرے ان تمام مزاحمتوں میں جو

لوگ حصہ لے رہے تھے وہ سب جنگجو بھلے ہی نہ رہے ہوں، اپنے غم وغصہ کا پرتشدد اظہار کرنے کے اہل تھے۔ ادبا وشعرا برطانوی مظالم اور ان کی ریشہ دوانیوں کے خلاف غم وغصہ رکھنے کے باوجود اس پُر تشدد طریقہ کار سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تلوار کے نہیں قلم کے دھنی تھے۔ یہ لوگ اپنے قلم کے ساتھ مختلف سطحوں پر ذہن سازی، معاشرتی اصلاحات اور عوامی بیداری کے عمل میں منہمک تھے اور ان کے کارنامے انہی میدانوں سے متعلق تھے۔ ان سے جنگ کے میدان میں آکر تلوار اٹھا لینے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ احترام وعزت کے محفوظ حصار میں رہ کر علم وادب کی خدمت کرنے والے ان لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے جان دینے کی عادت بھی نہیں تھی اور یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ اس لیے انگریزوں سے نبرد آزمائی کے لئے ان کی شمولیت کو لازمی قرار دے کر انہیں معتوب قرار دینا بہرحال ان کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

(دو)

انگریزی فوج میں شامل ہندوستانیوں میں عدم اطمینان کے کئی اسباب تھے۔ مثلاً جن فوجیوں کی مدد سے انگریز سارے ہندوستان اور اطراف کے ممالک میں اپنی فتوحات کے پرچم بلند کر رہے تھے، انہیں معقول تنخواہ تک نہیں دے رہے تھے۔ اس کی وجہ سے اکثر فوجیوں نے ۱۸۵۷ء کے پہلے بھی علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ۱۸۴۴ء میں ۳۴ویں دیسی پلٹن، ۱۸۴۹ء میں ۲۲ویں پلٹن، ۱۸۵۰ء میں ۶۶ویں پلٹن اور ۱۸۵۲ء میں ۳۸ویں پلٹن نے ان جگہوں پر جانے سے انکار کر دیا تھا جہاں انگریز انہیں لے جانا چاہتے تھے۔ ان کا یہ احتجاج انگریزی قوانین کے دائرے میں تھا کیونکہ بنگال آرمی کو جس میں اتر پردیش اور بہار کے جوانوں کی اکثریت تھی، باہر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ ان کے احتجاج کو طاقت کے زور پر نہ صرف دبا دیا گیا بلکہ متعلقہ لوگوں کو عبرت ناک سزائیں بھی دی گئیں۔ انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کی فضا سارے ہندوستان میں بن رہی تھی۔ لکھنؤ میں ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان گیر مسلح بغاوت کا منصوبہ تیار ہوا تھا لیکن اسی درمیان اینفیلڈ رائفلوں اور گائے اور سور کی چربی والے کارتوسوں کا قضیہ سامنے آگیا۔ ۶ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے جوانوں نے ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا، اس پر ان کا کورٹ مارشل ہوا اور انہیں دس سال تک کی سخت سزائیں دی گئیں۔ سرعام ان کی وردیاں اتار کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اس عمل نے جوانوں کو مزید مشتعل کر دیا اور انہوں نے اشتعال میں آکر قبل از وقت یعنی ۱۰ر مئی کو ہی انگریزوں کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ میرٹھ میں انگریزوں کا قتل عام کرنے کے بعد ۱۱ر مئی کو یہ سیلاب دہلی پہنچا اور یہاں بھی انگریزوں کا قتل عام شروع ہوا، جو بعد میں بہادر شاہ ظفر کی مداخلت سے رکا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور زبردست تھا کہ انگریزوں کی ایک نہ چلی اور نتیجے کے طور پر ان باغیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی میں رونما ہونے والے ان اچانک واقعات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور چاروں طرف جیسے انگریزوں کے خلاف عوامی غصے کا لاوا ابل پڑا۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے بھی اپنے حامیوں کے ساتھ وہاں سے انگریزوں کو بھگا کر لکھنؤ کو اپنے قبضے میں لے لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ لیکن انگریزوں کی بے پناہ اور ناقابل تسخیر قوت کے سامنے یہ فتوحات بہت عارضی ثابت ہوئیں۔ انگریزوں نے ایک بار پھر اپنی تمام قوت کو مجتمع کر کے تقریباً ساڑھے چار مہینے بعد دہلی پر دوبارہ حملہ کیا۔ دہلی کی جنگ ان معنوں میں عجیب رہی کہ باغیوں کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کی سربراہی میں پچاس ہزار کی فوج تھی جس میں نظم ونسق کا فقدان تھا اور دوسری طرف ایک نسبتاً قلیل انگریزی لشکر پورے نظم وضبط کے ساتھ موجود تھا۔ فتح بالآخر انگریزوں کے ہاتھ رہی اور دہلی ایک بار پھر انگریزوں کے خونیں شکنجے میں چلی گئی۔ رفتہ رفتہ انگریز وہ تمام علاقے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے جو باغیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

اس دوران مرزا غالب کی مصروفیت کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ان کی سوانح ترتیب دینے والوں کے لیے ان کے خطوط سب سے بڑے ماخذ تھے، جو اس دوران بالکل نہیں لکھے گئے۔ اِدھر اُدھر سے جو معلوم ہو سکا ہے وہ بس اتنا کہ وہ تمام وقت گھر میں بند رہے اور برہانِ قاطع کا مطالعہ کر کے اس میں اصلاحات کرتے رہے۔ دستنبو کا کام اس وقت تک وہ شروع نہیں کر سکے تھے۔

(تین)

مرزا غالب نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک رونما ہونے والے ایسے واقعات کو فارسی زبان میں 'دستنبو' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے، جس میں بغاوت کی تفصیلات کے دوش بدوش ان کے خاندانی کوائف کا بیان بھی موجود ہے۔ بغاوت سے متعلق واقعات کے وہ چشم دید گواہ نہیں تھے۔ وہ اس ہنگامے کے دوران اپنے گھر سے باہر بھی نہیں نکلے تھے۔ ظاہر ہے ان کے سارے بیانات سنے سنائے تھے۔ ان کے راوی معتبر ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مستعار معلومات کے باوجود انہوں نے آخر ان واقعات کو قلمبند کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کا مقصد تاریخ نویسی بہر حال نہیں ہو سکتا، بھلے ہی انہیں خاندانِ مغلیہ کی تاریخ نویسی کی خدمات انجام دینے کا تجربہ رہا ہو، جسے وہ خود اپنے مختلف مکتوبات میں مزدوری سے تعبیر کر چکے ہیں۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی حکام نہ صرف ان حالات کو قلمبند کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے بلکہ انہیں انعام و اکرام سے بھی سرفراز کر رہے تھے۔ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا کہ ہر شخص انگریزوں کی پوشیدہ حکمتِ عملی کا سراغ لگا سکے۔ ان حکام نے مرزا سے ایسی کوئی فرمائش کی ہو اس کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ چونکہ وہ انگریزوں کی نظر میں مشکوک تھے۔ ان پر بہادر شاہ ظفر کے دربار سے متعلق ہونے اور ان کے لئے سکہ لکھنے کا الزام پہلے ہی لگ چکا تھا۔ دس برس پہلے جوا خانہ چلانے کے جرم میں وہ سزا بھی بھگت چکے تھے۔ اس لئے وہ انگریزوں کو خوش کر کے انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانے اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے اپنے بعض معاملات کو سلجھانے، خصوصاً اپنی پنشن کا قضیہ، خاندانی عزت ووقار، نام و نشان اور خلعت دربار کی بحالی کا کوئی راستہ نکالنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے از خود ایسا ارادہ کیا۔ وہ ساری زندگی اپنی خاندانی عزت اور پنشن کے حصول اور اس کی رقم میں اضافے کے لئے پریشان رہے اور کلکتہ جیسے دور دراز علاقے کا سفر بھی اسی مقصد کے تحت کیا۔ تمول اور سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کی فطری خواہش بھی ان کے اندر بڑی شدت کے ساتھ موجود تھی۔ اس لیے جب انہوں نے

دیکھا کہ لوگ اس ہنگامے کی تفصیلات تحریر کر کے انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو انہیں بھی یہ کام اپنی وفاداری ثابت کر کے اپنے مفادات کی تکمیل کا ایک ذریعہ نظر آیا۔ یعنی اس روزنامچے کو لکھنے کا مقصد لکھنے کے پہلے ہی یہ متعین ہو چکا تھا کہ انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اپنی جان بچانے کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی پنشن کی بازیابی کی تکمیل پیدا کی جائے۔

دستنبو کی اشاعت نومبر ۱۸۵۸ء میں ممکن ہو پائی۔ یعنی اس بغاوت کے ٹھیک ڈیڑھ برس بعد۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے تھے۔ پریس آزاد نہیں رہے تھے۔ انگریزوں کی اجازت کے بنا کسی اخبار یا کتاب کی اشاعت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن غالب کی متواتر تگ و دو کے بعد یہ کتاب اشاعت کے مراحل سے گذر کر منظر عام پر تو آ گئی اور اسے گورنر جنرل بہادر لارڈ کیننگ کی خدمت میں پیش بھی کر دیا گیا لیکن اس سے مرزا غالب کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ نہ تو انہیں وفاداری کی سند ملی، نہ پنشن کی بازیابی کی تکمیل بنی اور نہ انگریزوں کو ان کی وفاداری پر یقین آیا۔ ظاہر ہے اگر اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے غالب کی تگ و دو کی اس ناکامی پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ خوف و ہراس کے اس ماحول کے باوجود دہلی میں مقامی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے درختوں کی شاخیں اور توپوں کے دہانوں کی قلت ہو گئی تھی اور جب ذرا سی بے احتیاطی کسی کو بھی تختہ دار تک پہونچا سکتی تھی، غالب نے اس میں بیان کردہ واقعات میں ایسے پیچ چھوڑ دیے تھے جو انگریز آقاؤں کو پسند نہیں آئے۔ حالانکہ انہوں نے مرزا یوسف کے انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہو جانے کا ذکر بھی اس تصنیف میں نہیں کیا کہ کہیں انگریز ناراض نہ ہو جائیں، اس امکان سے انکار آسان نہیں کہ اندر سے وہ کچھ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ ان کی اس کتاب سے انگریز خوش بھی ہو جائیں اور انگریزوں سے نجات کی کوشش کرنے والوں پر کوئی کاری ضرب بھی نہ لگے۔ اس وقت کے تمام دور اندیش لوگوں کی طرح مرزا یہ بات بہر حال سمجھ رہے تھے کہ اب مغلوں کے تخت و تاج کے دن ختم ہوئے اور آنے والے دنوں میں انگریز ہی اس ملک کی قسمت کے مالک ہوں گے۔ یہ وقت اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے مناسب تھا بھی نہیں۔ اسی دور بینی کے تحت انہوں نے سرسید احمد خان کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ اب مغلوں کی عظمت بیان کرنے میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ انگریزوں کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ کر کے انہیں سمجھنے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں اور تاریخ نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ مرزا کا یہ خیال غلط نہیں تھا۔ انگریز اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔

رہی اس کتاب میں انگریزوں کی مبالغہ آمیز مداحی اور مجاہدین کے لئے توہین آمیز ہجو یہ کلمات کے استعمال کی بات۔ تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس دور میں مرزا غالب اپنی زندگی گذار رہے تھے اس وقت آقاؤں کی مداحی کا مقصد حقیقت بیانی نہیں محض اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار اور انعام و اکرام کا حصول ہوتا تھا۔ چنانچہ مدح میں مبالغہ ایک روایت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اگر کوئی اس سے گریز کرتا تو اس کے شاعر ہونے کو ہی شبہے کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دوسرے تمام شعرا کی طرح خود غالب نے بھی بہادر شاہ ظفر اور مختلف والیان ریاست اور امرا کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں بھی مبالغہ عام روایت سے ہٹ کر نہیں ہے۔ داستان نویسی کا سلسلہ شروع ہوا تو مداحی کی یہ روایت وہاں بھی اپنا جلوہ دکھاتی رہی۔ اس روایت کی پیروی میں قصیدہ گوئی اور دستنبو کی مداحی کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ یعنی ممدوح کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنی شاعرانہ اہمیت اور بیان پر اپنی قدرت کا اظہار کر کے شایان شان انعام و اکرام حاصل کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ غالب نے دستنبو میں عام اور رائج فارسی زبان کا استعمال نہ کر کے عربی سے یکسر عاری زبان کا استعمال کیا۔ یعنی وہ محض یہ ثابت کرنے کے لئے کوشاں تھے کہ مجھ جیسا فن کار اور زبان داں روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ہمارے ناقدوں کی بے احتیاطی سے غلطی یہ ہو رہی ہے کہ وہ غالب کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کے علاوہ سرگرم مجاہد آزادی کی شکل میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ اس وقت کی موجود سنگین صورت حال میں ایک عام انسان جو کر سکتا تھا، مرزا غالب نے بھی فطری طور پر وہی کیا۔ مجبوراً ہی سہی، چھوٹے بڑے ہندوستانی حکمرانوں سے لیکر فوجی جوانوں تک، بشمول شہنشاہ ہندوستان بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے باج گذار اور ملازم ہو چکے تھے۔ عوام کی تو کچھ کہیے ہی نہیں۔ تخت پر کون ہے، ان کے نزدیک یہ بات اس وقت تک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جب تک ان کی روز مرہ کی زندگی میں مداخلت کر کے دشواریاں نہ پیدا کر دی جائیں۔ اور اب اس غلامی کو تقریباً ایک صدی کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اگر انگریز حکام غیر ضروری مظالم سے کام نہ لیتے تو رفتہ رفتہ تمام مقامی لوگوں کو اس محکومی کی عادت پڑتی جا رہی تھی۔ ان سب کے دلوں میں بھلے ہی انگریزوں کے لیے کچھ نفرت رہی ہو لیکن وہ ان کا ہر حکم مان رہے تھے۔ اگر انگریزوں کے مظالم اپنے حدود سے تجاوز نہ کرتے اور وہ کچھ انصاف سے کام لیتے تو غالب اور مجاہدین کی فکر میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔ فوجی جوانوں کی روزی روٹی اور عزت پر آنچ نہ آتی اور انہیں شک و شبہ کی نظروں سے نہ دیکھا جاتا تو غالب کی طرح ان کی وفاداریاں بھی انگریزوں کے ساتھ ہی رہتیں۔ فوجیوں کی طرح غالب کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جو ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا اور ان کے دل میں بغاوت کی کونپلیں پھوٹتیں، اس لیے ان کی انگریزوں سے وفاداری برقرار رہی۔ کیونکہ انگریزوں سے 'مربی اور پروردہ' کا ان کا رشتہ اس وقت تک کم و بیش دو پشت پرانا ہو چکا تھا۔

ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ مولوی محمد باقر (محمد حسین آزاد کے والد) اور شیخ ابراہیم ذوق جیسے شعرا و ادبا کا ایک حلقہ ایسا بھی تھا جنہوں نے ۱۸۴۷ء میں جوا خانہ چلانے کے جرم کے تحت غالب کو ملنے والی سزا پر خوشیاں منائی تھیں۔ ذوق تو اس بغاوت تک رہے ہی نہیں البتہ یہ اتفاق ضرور ہوا کہ ان میں سے مولوی محمد باقر اور ان کے رفقا جیسے کچھ لوگ بھی اس بغاوت میں پیش پیش رہے، جن سے غالب کو بہت چڑ تھی۔ ان لوگوں کو شاید لگ رہا تھا کہ وہ اس بغاوت کے ذریعے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا ہو نہیں سکا۔ اس کے برعکس غالب کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ فی الوقت انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا ممکن نہیں۔ چنانچہ ان کے لئے

یہ غیر منظم بغاوت بے مقصد جانوں کے زیاں سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ غالب کا یہ اندازہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ اس بغاوت کا نتیجہ مسلمانوں کی بربادی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کی شکل میں نکلا۔ بغاوت کے نتیجے میں جب ان لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو مرزا غالب 'حق بہ حق دار رسید' کے مصداق اسے مناسب تصور کرتے رہے اور دستنبو میں ان باغیوں کے لیے کچھ نازیبا کلمات لکھنے سے خود کو نہیں روک سکے۔

مرزا غالب اس بغاوت کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اس کے پیچھے اور بھی کئی اسباب تھے۔ وہ ایک ذہین شاعر اور حساس فن کار تھے۔ حالات کا تجزیہ کرنے کی اہلیت اور دوراندیشی کی صفت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ ایک ہمدرد اور نرم دل کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے دوسرے واقعات اس بات کی گواہی دیں گے کہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھنا ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور وہ فوراً حتی المقدور ان کی مدد کرنے کو آمادہ ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں سکون پسندی اور امن دوستی داخل تھی۔ ہنگاموں سے انہیں چڑ تھی۔ اس لیے اس طرح کی بغاوت کو جس میں انسانوں کو اپنی جانوں تک سے ہاتھ دھونا پڑے، وہ پسند کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ دہلی اور دہلی کے قرب و جوار کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی بے گناہ مردوں، عورتوں اور معصوم بچوں پر بے جا مظالم ڈھائے گئے اور اکثر کو بے دریغ قتل کر دیا گیا، جس سے انہیں شدید تکلیف پہنچی۔ اس ہنگامے سے ان کی پرسکون زندگی میں نہ صرف خلل پڑا تھا بلکہ اس کے نتیجے میں جو انگریز یا ہندوستانی مارے گئے تھے ان میں کئی غالب کے مربی، دوست اور شاگرد تھے اور اب انہیں ان سب کے فراق میں بے یار و مددگار زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ غالب کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ متعدد اکابرین عصر اس جنگ میں کام آئے اور ان کے باعزت افراد خاندان اور خواتین خانہ نان شبینہ کی محتاج ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتی اور رحم کی بھیک مانگتی رہیں۔ جانے کتنی شہزادیاں اور شریف زادیاں اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے عصمت کا سودا تک کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس لیے جو اس ہنگامے کے ذمہ دار تھے، غالب ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

(چار)

آج آزاد اور محفوظ ہندوستان میں بیٹھ کر آزادی اظہار کے حق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اس ہنگامی دور سے متعلق جو چاہیں فیصلہ کر لیں۔ جسے چاہیں مورد عتاب ٹھہرالیں اور جسے چاہیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دے دیں۔ لیکن ہم اس عہد کے لوگوں کے ساتھ انصاف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم ان تمام لوگوں کی کارکردگی کا جائزہ اُسی تاریخی پس منظر میں لیں جس میں اور جہاں وہ سرگرم عمل تھے، آج کے تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت نہیں۔ تاریخ کا مسلمہ اصول بھی یہی ہے۔ تاریخ اور جذباتیت ساتھ ساتھ نہیں چلا کرتیں۔ حقائق سے روگردانی کئے بغیر ہم اپنے جذبات کی تسکین کے لیے یہاں کوئی آسان تلاش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس طرح جو ہمارے ہیرو ٹھہریں گے ان کی گمراہیوں اور غلطیوں پر یا تو ہماری نظر نہیں جائے گی یا ہم اس سے صرف نظر کریں گے، اور جو ہمارے ہیرو نہیں ہوں گے، ان کی خامیاں تلاش کر کے انہیں معتوب قرار دے لیں گے۔ اس طرح ہمیں ان کی خوبیاں نظر نہ آئیں گی اور خامیوں کو نظر انداز نہ کر پائیں گے۔ غالب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اور جو ہو رہا ہے اسے نہ تو تاریخ نویسی کا معیار کہا جا سکتا ہے اور نہ ادبی تحقیق و تنقید اسے گوارا کر سکتی ہے۔

●●

Ministry restores recognition to Paralympic Committee of India

The Ministry of Youth Affairs and Sports, Govt. of India has recognized Mr. Sultan Ahmed as the President of (PCI). Mr. Ahmed is also the Minister of State in the Union Ministry. The PCI recognizes that it is their duty to provide the right atmosphere and competitions for the Physically Challenged athletes, many of whom are very talented and capable of winning laurels and medals for India at various international competitions. Their performances will also encourage more physically challenged people to take to sports and improve their quality of life. **The emphasis of the PCI will be dope free, correct classification of athletes and appointment of qualified coaches with the support of Sport Authority of India.** A schedule for coaching camps etc is also being drawn.

ترجمہ کے امکانات ایم۔علی کے حوالے سے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
KOHSAR
BHIKANPUR - 3
BHAGALPUR - 812001
BIHAR

ایم۔علی کی تازہ ترین تکنیکی تصنیف ''ترجمہ آئینۂ فردا میں'' شائع ہوئی ہے جس کی رونمائی ماہنامہ انشاء کی سہ روزہ سلور جبلی تقریبات (3 تا 5 دسمبر 2010) کے دوران کلکتہ میں ہوئی۔

اپنے ذہن کی مقناطیسی قوت سے کام لیتے ہوئے ایم۔علی نے اپنی کتاب میں ترجمہ نگاری کے امکانات اور اس کی تشریحات وتعبیرات پر خصوصی توجہ دی ہے۔طریقۂ کار اور نظریے کی وضاحت کی ہے اور مترادفات وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی ادبی ترجمہ کے فن کو اعتبار بخشا ہے۔

لفظ ترجمہ کی حقیقت اور تحویلِ حرفی پر روشنی ڈالتے ہوئے ایم۔علی لکھتے ہیں:

''ترجمہ اردو کا لفظ ہے اور ٹرانسلیشن انگریزی کا لفظ ہے۔دونوں کا مفہوم انتقال سے عبارت ہے۔اس طرح لفظ ٹرانسلیشن بھی ایک منتقلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔لیکن یہ منتقلی صرف لسانیاتی ہوتی ہے۔ایک شخص جب کسی ایک زبان سے دوسری زبان کی کسی تحریر یا تقریر سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو ترجمہ کا سہارا لیتا ہے۔اگر اسے اس زبان سے واقفیت نہیں ہوتی ہے۔''

لفظ ترجمہ یا ٹرانسلیشن کا مفہوم دوسری زبانوں میں کس طرح رائج ہے اس کی تفصیل بھی ایم۔علی بتاتے ہیں کہ لفظ ٹرانسلیشن یورپی زبانوں میں لاطینی زبان سے آیا ہے۔اس کا لغوی معنیٰ ''پار لگانا'' ہے اور اسی لفظ کا اردو بدل ''ترجمہ'' عربی سے آیا ہے۔جدید یونانی زبان میں Metafora وین گاڑی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ مال و اسباب ایک مقام سے کسی دوسرے مقام تک پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے ۔مال برداری کے اس ذریعہ کو قدیم یونانی زبان میں Metaphorase کہتے تھے۔لاطینی زبان میں اس لفظ کا متبادل Translation ہے۔یعنی Metafora اور Translation دونوں کا مفہوم کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ یونانی علم البیان میں اس لفظ کا دوسرا مفہوم کسی لفظ کو دوسرے احساس میں منتقل کرنا ہے یعنی metafore کا مطلب Transference of a word to another sense. ہے۔ان ہی لفظوں کا بدل ''ترجمہ'' عربی زبان سے آیا ہے۔

لغات میں ترجمہ کے معنی کچھ اس طرح سے ہیں

۱۔ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ۲۔انتقالِ مکانی ۳۔ انتقالِ معانی ۴۔تفسیر و تعبیر ۵۔دیباچہ ۶۔بیانِ احوال ۷۔پار لگا دینا ۸۔التماس کرنا ۹۔خلط ملط کرنا ۱۰۔ تذکرۂ شخصی ۱۱۔نمائندگی ۱۲۔مبدّل ہونا ۱۳۔زندہ حالت میں آسمان پر پہنچانا

ترجمہ کا مفہوم نقلِ مکانی سے لیکر نقلِ معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہ واحد ذریعہ ہے جس کی بدولت دنیا میں مختلف تقاضوں کی حامل متفرق زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے خیالات ،نظریات، نفسیات، ادبیات، روایات اور خواہشات وغیرہ سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔اور اپنے نقطۂ نگاہ کو وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔

ایم۔علی نے معتبر تخلیق کار، ناقد اور تجزیہ نگار تھیوڈور کا نظریۂ ترجمہ پیش کیا ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جو لسانی رشتہ داریاں قائم کرتا ہے۔اس کے طریقۂ کار اور دائرۂ اثر کا جائزہ عظیم تر امکانات کی روشنی میں لینا چاہئے۔کیونکہ ترجمہ کی معیار بندی کا انحصار ترجمہ کی اثر انگیزی پر قائم ہوتا ہے۔ایک شہ پارے کا ترجمہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اگر کسی قاری کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیتا ہے تو یہ اس کی بڑی خوبی ہے۔اس لئے کہ ترجمہ نگار کا اصل مقصد قاری کو کوئی نئی زبان سکھانی نہیں بلکہ اسے چند خاص موضوعات سے باخبر کرنا ہے۔تھیوڈور نے ایک پابندی بھی عائد کی ہے کہ ترجمہ شدہ عبارت میں متنِ اصل کا اسلوب قائم رہنا چاہئے۔ایم۔علی نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے۔وہ دلیل دے کر بتاتے ہیں کہ ترجمہ شدہ متن کا اسلوب اصل متن کے مقابلہ میں کیسا ہے۔یہ تو صرف وہی بتا سکتا ہے جو دو زبانوں سے واقف ہو اور اصل تحریر کو پڑھ بھی چکا ہو۔ترجمہ شدہ تخلیق کے قاری کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اصل عبارت کا اسلوب کیسا تھا۔اسے تو غرض صرف زیرِ مطالعہ تحریر سے ہے۔

تہذیبوں کے عروج و زوال کا اثر ادب اور ترجمہ پر ہوتا ہے۔مشرقی تہذیب میں ترجمہ کی تاریخ ،مذہبی اور ادبی متون کے سلسلہ میں قدیم ہے۔مغرب میں ترجمہ کے فن کا مذہبی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ جدید زبانوں کے نشو و نما اور قومیت کے شعور سے بہت گہرا تعلق ہے۔اور ان دونوں کا لازمہ تعلیم و طباعت کی ترقی اور معاشرے میں درمیانی طبقے کا عروج ہے۔

ایم۔علی نے ایک مفکر ایوان (Evan) کا حوالہ دیا ہے اور اس کا قول پیش کیا ہے کہ چھوٹے بڑے نظاموں کی وحدت ہی ایک عظیم تر نظام کی بنیاد ڈالتی ہے۔چونکہ ایوان ہی سے نظریہ کثیر انظامیت منسوب ہے اس لئے مثال بھی دی ہے کہ سمندر چھوٹی بڑی مچھلیوں کا مسکن ہے۔وہ ایک ساتھ مل کر یہاں کی فضا اور ماحول تیار کرتی ہیں لیکن چھوٹی مچھلیاں ہمیشہ بڑی مچھلیوں سے خائف رہتی ہیں۔بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کرتی رہتی ہیں۔

اس مثال میں کثیر انظامیت ہے جو ایسی ہی صورت حال کی پروردہ ہے۔سمندری اور زمینی صورتِ حال میں ایک فرق ضرور ہے۔سمندر سے بڑی مچھلیوں کا کالعدم ہو جانا آج کے ممکنات میں شامل نہیں لیکن آئندہ صدیوں میں حیاتیاتی تغیر پذیری کے سبب ایسا ممکن بھی ہو سکتا ہے۔کثیر انظامیت میں ایک بڑا نظام چھوٹے نظام کو آہستہ آہستہ ختم کرتا رہتا ہے اور ایک دن اس نظام کو معطل کر کے اس کی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے۔اس عمل سے تہذیب اور زبان و ادب مختلف

سطحوں پر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیبیں اور زبانیں اسی اصول پر نما ہوتی ہیں اور قائم ہوتی ہیں۔ ایوان ترجمہ کی بھی تعریفوں کو مسترد کرتے ہوئے کہتا ہے:

Translation is no longer a phenomenon whose nature and boundries are given once and for all, but an activity depends on relation within a certain cultural system.

کلچر اور سماج ترجمہ سے متاثر ہوتا ہے۔ زبان میں ساختی اور فکری تبدیلیاں آتی ہیں۔ اور سیاسی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی شعور سے نئے نقوش ابھرتے ہیں۔

ترجمہ کے ممکنات اور ناممکنات اور ممکن الوقوعیت اور ناممکن الوقوعیت کے سلسلے میں ایم۔علی نے انگریزی، جرمن اور روسی زبانوں کے مفکروں کے خیالات سے معنی آفرینی کے دروازے وا کئے ہیں۔ لیکن ژاک دریدہ کی نظریہ سازی سے خصوصی بحث کی ہے۔ اور نظریۂ ساختیات اور ردِ تشکیل کی روشنی میں بتایا ہے کہ ترجمہ اور عبارت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ ربط کی نت نئی سطحوں کا عرفان اس وقت حاصل ہوتا ہے جب ایک ہی متن کے مختلف ترجمے سامنے آتے ہیں۔ ایم۔علی لکھتے ہیں؛

''ترجمہ اور عبارت میں جو ربط قائم ہوتا ہے وہ دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوتا ہے۔ نظامِ افتراق ہی معنی اور معنی نما میں ایک عارضی ارتباط کا سبب بنتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے نظامِ افتراق کو ترجمہ کے عمل سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ جھلکیاں جو معنی آفرینی سے عمل میں کچھ زیادہ ہی روشن ہو جاتی ہیں۔ اس لئے مشکل الحصول غیاب وجود میں سہل تر ہو جاتا ہے''۔

دریدہ نے تشکیک کے حیران کن مرحلے ابھارتے ہوئے بعض سوالات پر غور کرنے کی دعوت دی تھی:

۱۔ کوئی ترجمہ نگار دی گئی عبارت میں موجود نقطۂ نظر کی تردید کرے یا اس کے برعکس اپنا الگ مطمحِ نظر پیش کرے تو ترجمہ کی کونسی صورت نظر آئے گی؟ متن اور عبارت میں کیا فرق آ جائے گا؟

۲۔ اگر ترجمہ نگار یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ عبارت اصل کی بقا اس کے ترجمے پر ہی قائم ہے۔

۳۔ اگر ترجمہ نگار یہ دعویٰ کر ڈالے کہ عبارت میں پائی جانے والی خوبیاں عبارت کی اپنی نہیں بلکہ اس کے ترجمہ کی عنایت کردہ ہیں۔

۴۔ اگر کسی عبارت کے اقدار کا تعین اس کے مختلف ترجموں کے پڑھنے کے بعد کیا جائے۔

۵۔ اگر عبارت کی انفرادیت کسی سائنسی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے ثابت نہ کرکے اس کے ترجموں کی مدد سے شناخت کی جائے۔

۶۔ متن حالتِ تحریر سے ماقبل کیا تھا؟ اس کی کیا حقیقت تھی؟ کیا یہ ایک فارم تھا؟ ایک خیال تھا یا کچھ بھی نہیں تھا؟

۷۔ خیال و فکر ضبطِ تحریر میں آنے سے پہلے کس مقام پر تھے؟ اس مقام کے حوالے سے کوئی بحث بھی کی جا سکتی ہے یا کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے یا نہیں۔

ایم۔علی نے ترجمہ کے فن سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ترجمہ کی قدر و قیمت کے تعین سے پہلے اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے کہ ترجمہ کس نے کیا ہے؟ کیسے کیا ہے اور کیوں کیا ہے اور ایک مترجم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برہوا ہے؟ ایک شخص مندرجہ ذیل تقاضوں کے تحت ترجمہ نگاری کا کام انجام دے سکتا ہے۔

۱۔ اسے دلچسپ مشغلہ سمجھ کر۔

۲۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقرری کے پیشِ نظر۔

۳۔ اجرت کی ادائیگی صفحوں کی تعداد کی بنیاد پر۔

۴۔ کسی ادبی شہ پارے کی اہمیت سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی خواہش کے پیشِ نظر۔

قرأت، الفاظ کی معنویت، فکر کی اکائی اور حذف و اضافہ کی خیال بنی کو اجاگر کرتے ہوئے ایم۔علی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

۱۔ تحریر و تقریر اور اشارے انتقالِ فکری ہیں۔

۲۔ صرف لغوی معنی کی بنیاد پر ترجمہ ہمیشہ درست نہیں ہو سکتا ہے۔

۳۔ فکر کی اساس تک رسائی کے بعد ہی فکر کے اظہار کے لئے لفظوں کی جستجو ہوتی ہے۔

۴۔ حذف و اضافہ کو شجرِ ممنوعہ کا درجہ نہیں دینا چاہئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نفسِ مضمون مجروح نہ ہو۔

کیفیت کے اظہار کا ذکر کرتے ہوئے ایم۔علی بتاتے ہیں ''ترجمہ دراصل ایک خیال کو اپنی صلاحیتوں کی مدد سے اپنی یا کسی دیگر زبان میں منتقل کر دینے کا نام ہے۔ چونکہ زبانیں الگ ہوتی ہیں؛ تخلیق کاروں کے فکری زاویے مختلف ہوتے ہیں؛ مترجم کی شعور کی سطحیں الگ الگ ہوتی ہیں، اسلوب جدا ہوتے ہیں 'Vocabulary' میں لفظوں کی تعداد یکساں نہیں ہوتی اس لئے ان باتوں کا عکس ترجمہ میں صاف صاف جھلکتا ہوا پایا جاتا ہے۔ ''بوطیقا'' کا ترجمہ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں کیا ہے۔ صفحات پہ صفحات پڑھتے جائیں، الفاظ جدا جدا پائیں گے لیکن مفاہیم میں تقریباً یکسانیت ہی پائی جائے گی''۔

ایم۔علی نے زبان کی ظاہری اور صوتی صورتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کی فکری اکائی کو اہم قرار دیا ہے۔ اگر ترجمہ نگار کو فکری اکائی کا درست عرفان ہو جائے تو ترجمہ کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ فکر کو اکائی ماننے پر دوسری زبان میں اس کی نقش گری کی ایک سے زائد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک عبارت ''اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی'' کو اگر آپ فکر کی ایک اکائی مان لیں تو اس کے ممکنہ تراجم درج ذیل ہو سکتے ہیں:

There was no limit of his joy.
His joy was unlimited.
His joy knew no bounds.
His joy had no limit.
His joy was boundless.

بعض زبان کے لفظوں کا ترجمہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ صوتیاتی نظام کے تخالف کے سبب اس کی اثر انگیزی بھی مختلف درجات پر ہوتی ہے۔ ایم۔علی نے مختلف لہجوں پر ظہورِ معنی کے جدا جدا ہونے کا ذکر کیا ہے کہ فرانسیسی "U" (یو) کا انگریزی زبان میں کوئی متبادل نہیں ہے۔

"CH" انگریزی زبان میں ''چ'' کی آواز دیتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے ''کے'' کی آواز حاصل کرتے ہیں۔ جب کہ فرانسیسی اور عربی زبان میں اس سے ''ش'' کی آواز نکلتی ہے جیسے ''چارلس، شارلس

''وغیرہ۔ بنگلہ کے لفظ ابھیمان کا بدل نہ اردو میں ہے نہ انگریزی ہی میں ہے۔عربی لفظ زکوٰۃ کے پورے مفہوم کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔عربی زبان کی فصاحت و بلاغت اور گہرائی و گیرائی کا جواب نہیں ہے۔لفظ موت کے لئے بائیس الفاظ ہیں۔

صوتیاتی نظام اور لفظوں میں پوشیدہ استحکام، قوتِ معنی، اثر انگیزی، آہنگ اور اسلوب کو کسی بھی ترجمہ میں پوری طرح نہیں لایا جا سکتا۔ Die Uhr جرمن زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم ہاتھ گھڑی اور دیوار گھڑی ہے اس کا اردو ترجمہ مشکل ہے ۔اس طرح جاپانی لفظ Bakku Shan کا مطلب ایسی عورت ہے جو پشت سے خوبصورت اور سامنے سے بدصورت ہو۔اس کا متبادل شاید کسی زبان میں نہیں ہے۔

ایم۔علی نے ترجمہ نگار کی شناخت کے لئے مثال دی ہے جس کا لبّ ولباب یہ ہے کہ ایک ترجمہ نگار ،ناقد، محتسب، قاری، لغت ساز اور شاعر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تنقیدی بصیرت، فکری بلندی، افتادِ طبع اور موزونیت سے کام لیتا ہے۔اور اپنی زبان اپنے کلچر اور تہذیب و ثقافت کے قریب ہوتا ہے''شعری تخلیق کا نثری ترجمہ'' کے ضمن میں ایم۔علی۔ لکھتے ہیں

''شعری تخلیق کا نثر میں ترجمہ کرنا متن کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ایک کامیاب مترجم کی حیثیت اس کامیاب مصور کی سی ہے جو کسی کورے صاف ستھرے کاغذ پر جاذبِ نگاہ کسی رنگین پھول کی تصویر اس کمال ہنرمندی سے اتار دیتا ہے کہ تتلیاں خود بخود حلقہ بند ہوکر اس کے گرد منڈلا نا شروع کر دیتی ہیں یا اپنی جنبشِ قلم سے ایک دوشیزۂ حسن کے رخِ جمیل کی ایک ایسی تابناک تصویر کھینچ دیتا ہے کہ جسے جو بھی دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے ۔کچھ لوگ بظاہر ایسی مصوری کر بھی لیتے ہیں لیکن ماہر نگاہیں جب قریب پہنچتی ہیں تو اس حسنِ مجسم کی آنکھوں کو بے کیف و بے نور پاکر کفِ افسوس مل کر رہ جاتی ہیں ۔شعری متن کا نثری ترجمہ کرنے والے کچھ ایسا ہی کرتے ہیں''

آج اکیسویں صدی میں ترسیل و ابلاغ کے جدید انکشافات و ایجادات نے تہذیب کو گلوبلائزیشن کے تحت منصوبہ بند کر دیا ہے۔ایسے میں مشینی ترجمہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ایم۔علی نے جانکاری دی ہے کہ ترجمہ اور ڈیکوڈنگ کے لئے مشینوں کے استعمال کی ضرورت پر سب سے پہلے 1930ء میں ایک خاکہ بنایا گیا جسے A.C.Both نے عملی شکل دی ۔۱۹۵۴ء میں اس کی ایجاد کردہ مشین دنیا کے سامنے تھی۔

W.Weiner کی مشین بھی ذولسانی لغت ثابت ہوئی۔۱۹۷۰ء میں ان مشینوں کو اعراب سے آگاہ کیا گیا۔اوقاف و رموز کے آداب سکھائے گئے ۔املا کی غلطیوں سے بچنے کی ترکیبیں بتائی گئیں ۔غرض شعور سے متصف کیا گیا ۔اس طرح مشینوں نے Automatic Language Processing System کے سہارے تیز تر ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔لیکن بقول ایم۔علی ایک بات ذہن نشیں ہونی چاہئے کہ آوازوں کی مدد سے حاصل کئے گئے تراجم کی خامیوں کے شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے خامیوں کی مثالیں دی ہیں۔

ایک مثال دیکھئے:

پاکستان کے کسی سیمینار میں ایک مقرر نے غلط ترجمہ کے حوالے سے اخبار میں چھپی خبر کا ایک ٹکڑا پڑھا:

A woman was shot deadin
a temple.

(یہاں مندر میں ایک قتل کے واقعہ کا ذکر ہے)

اگر مذکورہ جملے کو سامنے رکھا جائے تو ترجمہ نگار نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ویسے Temple کے کئی مفاہیم ہیں۔مثلاً :۱-عبادت گاہ۔۲-ذاتِ الٰہی کا مستقر۔۳- انسانی جسم۔۴- یہودیوں کا ایک مقدس مقام۔ ۵- صومعہ۔ ۶ -کنشت۔ ۷-کرگھے میں استعمال ہونے والی ایک لکڑی۔ ۸-عیسائیوں کا معبد۔ ۹-مندر۔ ۱۰-کنپٹی۔ ۱۱- فرانس کے پروٹسٹنٹ فرقے کا ایک گرجا۔

جہاں تک انگریزی کے اس مذکورہ جملہ کا اردو ترجمہ کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔یہاں ترجمہ کی غلطی نہیں بلکہ واقعہ کی غلطی ہے کیونکہ اس عورت کو مندر میں نہیں بلکہ کنپٹی میں گولی ماری گئی تھی۔

ایم۔علی نے اردو ترجمہ نگاروں کی فنی اور فکری محور پر بھی روشنی ڈالی ہے اور شخصی وفور کے ساتھ اداروں کی آفاقی بین السطور کی اثر آفرینی کی عکاسی بھی کی ہے۔ترجمہ کے فروغ کے لئے ۱۸۴۱ء میں دلی کالج میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔ترجمہ کے میدان میں فورٹ ولیم کالج کے کار ہائے نمایاں سے بھی واقف ہیں۔عثمانیہ یونیورسٹی کا دارالترجمہ، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد، اردو اکیڈمی، جامعہ ملیہ اور انجمن ترقی اردو ہند کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔نئی الحال ساہتیہ اکاڈمی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی اس ضمن میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں ۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سرگرمیوں نے ترجمہ کی رفتار کو تیز تر کیا۔قدیم بھارت پر نظر ڈالیں تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہاں کی ساری زبانوں میں ادب کی بنیاد ترجمہ پر ہی رکھی گئی ہے۔

ایم۔علی نے ترجمہ کے قالب کو استحسان کی رعایت اور غایت سے دیکھا اور پرکھا ہے ۔ان کے خیالات ،نظریات، اور ادبیات سے آگہی ملتی ہے اور ترجمہ کے سلسلے میں نقطۂ نگاہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے وسیع تجربہ اور عمیق مشاہدہ ومطالعہ سے قندیلیں روشن کی ہیں اور اردو کے ساتھ عالمی تناظر میں ترجمہ کے امکانات کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔وہ تخلیقی وتنقیدی شعور کے مالک ہیں اور ترجمہ نگاری کے رموز سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں ۔اور حقیقی مباحث اور دریافت و پہچان کے لئے روح تک رسائی کی حاصل کی ہے اور ترجمہ کی زبان کی وسعت پر روشنی ڈالی ہے۔ساتھ ہی معنوی سطح پر لطیف لسانیاتی پہلو سے پیدا شدہ مسائل کے احتمال کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ ●●

خواجہ محفوظ الرحمٰن ۔ ایڈوکیٹ
12022, Isle Vista Drive
Houston,
TX77041-5768 (U.S.A.)

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بتایا جاتا ہے کہ سابق وزیراعظم میاں نواز شریف صاحب جدہ سعودی عرب میں ایک ایسی اسٹیل مل تعمیر کر چکے ہیں جو نہ صرف آرٹ کا نمونہ ہے بلکہ دنیا کی تمام جدید ترین سہولتوں کا مجموعہ ہے۔ فولاد پگھلانے والی بھٹیوں کے علاوہ پوری اسٹیل مل اور اس کے سارے دفاتر کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اشیائے ضرورت کے سٹورز کی ایک Chain بھی کھول چکے ہیں جہاں تمام اشیاء مل سکتی ہیں۔ لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر دولت کہاں سے آئی کہ اسٹیل مل اسٹور اور پلازے بھی کھل گئے ہیں۔ پاکستان میں انکم ٹیکس پراپرٹی ٹیکس ویلتھ ٹیکس کا حساب لگایا جائے تو ان کی حالت قابل رحم دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔

ایک بات بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے کاروبار میں سارے ملازم ہندوستان سے منگوائے ہیں۔ پاکستانیوں کو چند معمولی جاب صفائی، چائے بنانے وغیرہ پر رکھا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

جماعت اسلامی کے افراد جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں شامل تھے۔ ان کے ریفرینڈم میں جماعت نے بھرپور مدد کی تھی۔ ضیاء الحق کو امیر المومنین کا خطاب دیا تھا۔ ریفرنڈم میں سوال تھا ''اگر اسلام چاہتے ہو تو جنرل ضیاء الحق کو ووٹ دو''۔ پاکستان اسلامی ملک ہے۔ اسلام کو نہ چاہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیگل فریم ورک، ایل ایف او، B (2) 58 کا کارنامہ جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی وجہ سے چار جمہوری حکومتیں ختم ہوئیں۔ غیر جماعتی الیکشن کسی جمہوریت میں نہیں ہوتا۔ لیکن ضیاء الحق نے غیر جماعتی الیکشن کروایا۔ جماعت اسلامی کو وردی میں صدر پسند تھا، ایل ایف او پسند تھا۔ اب پسند نہیں ہے آخر کیوں؟۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بے نظیر صاحبہ عدالت سے اجازت لیکر گئی تھیں۔ ان کو واپس آنا چاہئے تھا۔ اب پھر جب چاہیں اپنے ملک واپس آسکتی ہیں۔ ان کو نہ کسی نے نکالا اور نہ ہی واپس آنے سے روکا ہے۔ عدالت میں مقدمات التوا میں پڑے ہیں۔ زرداری کے خلاف مقدمات نواز شریف نے تحقیق کئے تھے۔ سیف الرحمان نے خود تحقیقات کیں۔ نواز شریف نے بے نظیر کے خلاف بھی مقدمے بنائے۔ آج نواز شریف، پیپلز پارٹی دونوں مشرف کے خلاف ہیں۔ آپس میں دوست ہیں۔ بے نظیر پاکستان کے خلاف بیان برابر دے رہی ہیں۔ ملکی دفاع کے بارے میں بھی فرماتی ہیں کہ پاکستان کو F16 نہ دیئے جائیں۔ ہندوستان میں بیٹھ کر اپنے ملک کے خلاف بیان دینا سیاسی تدبر کے خلاف ہے۔ دشمنی میں اپنے ملک کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ پاکستان ہے تو ہم سب ہیں۔ اگر ملک کو نقصان ہوا تو سب کو بھگتنا پڑے گا۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

پاکستان میں سیاسی دینی جماعتوں نے چند مسلح تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ مثلاً جمعیت طلبہ، شباب ملی اور تحفظ اسکواڈ وغیرہ وغیرہ۔ ان سے کام بھی لیتے رہتے ہیں۔ حال کے واقعات گجرانوالا میں ایک سرکس میں تماشا ہو رہا تھا۔ ہال تماش بینوں سے بھرا ہوا تھا۔ شباب ملی تنظیم نے اچانک حملہ کر دیا تماش بینوں کو ڈنڈوں سے بری طرح پیٹا، بھگ دوڑ مچ گئی۔ خواتین بچے کچھ دوسرے افراد کچلے گئے۔ سرکس کو تباہ کیا گیا۔ بورڈ پر جن خواتین کی تصاویر تھیں کالک پھیر دی۔ بورڈ توڑ دیئے گئے۔ ملتان میں بھی اسی قسم کے واقعات ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے نام پر غنڈا گردی، توڑ پھوڑ لوگوں کو مارنا پیٹنا جائز ہے؟۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سیاسی دینی جماعتوں میں سے کسی ایک نے بھی اس دہشت گردی کے عمل کی مذمت نہیں کی کیونکہ جن تنظیموں نے دہشت گردی کی ہے وہ سیاسی دینی جماعتوں کی اپنی ہیں۔

فی الحقیقت کوئی جماعت اسلام کی ٹھیکیدار نہیں ہے۔ قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے ''کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو''۔

اسلام امن کا دین ہے۔ اسلام دہشت و بربریت کا مذہب نہیں ہے۔ علماء حضرات دہشت و بربریت کے عمل سے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ اسلام میں ہر قانونی سزا عدالتی معاملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص جرم کرتا ہے تو اس کو قانون کے حوالے کرنا چاہئے کسی شخص یا اشخاص کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود اس کو سزا دے ڈالے۔

پشاور، ملتان اور گجرانوالا میں دہشت گردی ہوئی۔ عوام کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ اگر ان کا ردعمل ان افراد کے خلاف ہونا شروع ہوا تو اور خرابی ہوگی۔

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

●●

محمود الحسن (پاکستان)

ظفر حسن کی ادبی کاوشیں

Dr Zafar Hasan

گلزار پر ڈاکٹر ظفر حسن کی کتاب نے ان کے قریبی دوستوں کو بھی حیرت میں ڈالا۔ ممتاز ادیب انتظار حسین نے لکھا ''ہم ظفر حسن کو علمی و تحقیقی کام کے اعتبار سے جانتے تھے۔ ان کا یہ کام ''سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ وہاں سے انہوں نے کتنی لمبی زقند لگائی ہے۔ سرسید اور حالی سے گزر کر گلزار پر پہنچے اور ان کے فلمی کارناموں کا جائزہ لے ڈالا''۔ انتظار صاحب کا استعجاب اپنی جگہ بجا، لیکن ہمیں ڈاکٹر ظفر حسن کی اس زقند سے حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ جس جید ادیب یعنی محمد حسن عسکری کے سائے تلے رہ کر انہوں نے پر پرزے نکالے ہیں، ان کے فکری سفر کے بارے میں خود انتظار صاحب نے ہی لکھا ہے ''ابتدا جیمز جوائس، انتہا مولانا اشرف علی تھانوی، محمد حسن عسکری کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے''۔ محمد حسن عسکری کی زقند بہر حال ظفر حسن کی زقند سے ہمارے خیال میں بڑی ہی ہے۔

ڈاکٹر ظفر حسن کا تذکرہ پہلے پہل ہم نے محمد حسن عسکری کے شمس الرحمٰن فاروقی اور عبادت بریلوی کے نام خطوط میں پڑھا، جن میں عسکری صاحب، ظفر حسن کا تعارف اپنے نوجوان دوست کی حیثیت سے کراتے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر حسن کے بقول ''میں خود کو ان کا شاگرد ہی سمجھتا ہوں اب یہ ان کی محبت تھی کہ وہ مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے''۔ عسکری صاحب سے ان کا تعلق دو عشروں پر محیط رہا۔ محمد حسن عسکری سے انہیں ان کے دوست احمد مقصود حمیدی نے متعارف کرایا۔ محمد حسن عسکری کا ذکر چھڑ جائے تو اس منکسر المزاج شخص کے چہرے پر چمک آجاتی ہے۔ اردو کے اس جید ادیب کے بارے میں یادوں کو تازہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بتانے لگے ''محمد حسن عسکری علم کا بحرِ ذخار تھے۔ دنیا جہاں کے علوم سے آگاہ۔ ان کے شاگرد ہر روز ان کے ہاں ہجوم کرتے اور وہ بغیر معاوضے کے انہیں تعلیم دیتے۔ ایک بار ایک طالب علم ان کے ہاں آیا اور ان سے جیمز جوائس کے ناول یولیسیز (Ulysses) کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی۔ عسکری صاحب نے ادھر بیٹھے بیٹھے ہی اس ناول کے بارے میں معلومات کے دریا بہا دیئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے ابھی ابھی ناول پڑھا ہو۔ (Ulysses) کو تفہیم کے لحاظ سے دنیا کا مشکل ترین ناول سمجھا جاتا ہے۔ چند ماہ قبل ایک سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ ایسی کتابیں جن کے بارے میں لوگ پڑھے بغیر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ پڑھ رکھی ہیں، (ان میں یولیسیز پہلے نمبر پر تھی)۔ اطہر صدیقی نے ''سات رنگ'' نکالنے کا فیصلہ کیا تو عسکری صاحب سے وعدہ لیا کہ وہ رسالے کے واسطے مضمون لکھا کریں گے۔ وہ مان گئے اور کہا کہ رسالے کو حتمی شکل دینے سے تین دن قبل مجھے بتا دینا، میں مضمون لکھ دیا کروں گا۔ پروفیسر کرار حسین کے وہ باقاعدہ شاگرد کبھی نہ رہے تھے۔ میرٹھ میں بس ایک روز کسی استاد کی غیر حاضری پر عسکری صاحب کو ایک پیریڈ پڑھایا تھا، بس اسی بنیاد پر کرار صاحب کو اپنا استاد قرار دیتے اور ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔ سلیم احمد سے ان کی ناراضی کی وجہ شاید یہ رہی کہ انہوں نے خود کو عسکری صاحب سے بڑا لکھنے والا سمجھ لیا تھا۔ بڑے ادیب تو وہ تھے ہی لیکن وہ ایک بڑے انسان بھی تھے''۔

ڈاکٹر ظفر حسن کے والد فضل حسن علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ کان پور میں ان کے ہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ حسرت موہانی، ملا واحدی اور ملا رموزی ایسے ناموروں کا ان کے ہاں آنا تھا۔ معروف شاعر نشور واحدی سے ان کے خاندانی مراسم تھے۔ ڈاکٹر ظفر حسن کے والد نے کراچی میں بھی ادب دوستی کا سلسلہ برقرار رکھا جس کا احوال مشتاق احمد یوسفی نے اپنے منفرد اسلوب میں یوں بیان کیا ہے'' میاں فضل حسن شعر و ادب، شکار اور موسیقی کے رسیا تھے۔ جامع الحیثیات شخصیت، کئی ہزار کتابوں اور ایک مل کے مالک تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کو اس طرح جمع کرتے تھے جیسے بچے ڈاک کے استعمال شدہ ٹکٹ یا خارج المعیاد یعنی پرانے سکے جمع کرتے ہیں''۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتاب ''زرگزشت'' کو اپنے جن دو دوستوں کے نام معنون کیا ہے، ان میں ایک میاں فضل حسن ہیں۔

ڈاکٹر ظفر حسن سے ان کے ہمدم دیرینہ کی شخصیت کے بارے میں جاننے کے ہم مشتاق ہوئے تو انہوں نے بتایا ''مشتاق احمد یوسفی بینک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے۔ مزاج میں قناعت، سادگی اور درویشی جوں کی توں رہی۔ داد و ستد کے کھرے۔ پابند صوم و صلوٰۃ۔ فوٹو گرافی میں بھی درک رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں کئی کردار ایسے ہیں جو میرے دیکھے بھالے ہیں، یوسفی صاحب نے کمال ہنر مندی سے ان حقیقی کرداروں کو اپنے تخلیق کردہ ادب میں کھپایا ہے۔ وہ لاہور آئیں تو ان سے ملاقات رہتی ہے، میرا کراچی جانا ہو تو بھی ان سے ملنے ضرور جاتا ہوں۔ معروف فلم ساز ڈبلیو زیڈ احمد سے میری ملاقات رہتی تھی۔ انہوں نے ایک بار یوسفی صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ یوسفی صاحب لاہور آئے تو میں نے انہیں بتایا کہ ڈبلیو زیڈ احمد آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ میں انہیں اپنے ہاں بلا لیتا ہوں۔ یوسفی صاحب کی بڑائی دیکھیے! کہنے لگے: وہ ہمارے بڑے ہیں ہمیں خود چل کر ان کے ہاں جانا چاہیے''۔

''سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت'' ڈاکٹر ظفر حسن کی ڈاکٹریٹ کا موضوع تھا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کتاب کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس راہ پر ڈالنے والے بھی محمد حسن عسکری ہی تھے۔ اس وقیع تصنیف کی غایت کے بارے میں مختصراً عرض کرنے کا کہا تو وہ یوں گویا ہوئے ''سرسید احمد خان کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی خدمات سے انکار نہیں۔ وہ نیک طینت آدمی تھے۔ مسلمانوں کی بھلائی کے صدق دل سے خواہاں تھے۔ سرسید مسلمانوں کی نجات مغربی نظام فکر کی تقلید میں ڈھونڈتے تھے۔ ان کی دانست میں اس فکری نظام کی بنیاد فطرت اور عقل کے مخصوص تصورات پر مبنی ہے۔ فطرت پر وہ زیادہ اصرار کرتے تھے اس لیے ان کے مخالفین کی جانب سے انہیں نیچری

بھی کہا گیا۔ ان کے نظریہ فطرت کے مطابق انسان بنیادی طور پر اچھائی کی طرف مائل ہے اور اس کی طبیعت اسے صحیح کام کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ فطرت کو سرسید کے افکار میں خشت بنیاد کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں اس بارے میں زیادہ تحقیقی کام نہیں ہوا، اس لیے میں نے اس پہلو پر کام کرنے پر توجہ کی۔ میں نے اپنی کتاب میں جائزہ لیا ہے کہ مغرب میں اس تصور نے کیسے اور کن حالات میں جنم لیا۔ اس سے پہلے مغرب میں کیا نظام فکر تھا اور پھر اس کو کیوں چھوڑا گیا۔ بیسویں صدی میں نظریہ فطرت پر کیا گزری اور یہ کن تبدیلیوں سے دوچار ہوا جبکہ سرسید کے نزدیک تو تصور فطرت اٹل اور غیر مبدل حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے سرسید سے یہ سہو ہوا کہ وہ مذہب کے ان معاملات میں جن کا تعلق مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات سے ہے، ان کی تشریحات بھی تعقل کی بنیاد پر کرتے تھے جس سے بڑی گڑبڑ ہوئی اور ان کے خلاف علماء نے کفر کے فتوے بھی دیے۔ سائنس اور مذہب کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی جو کوشش، ان کی طرف سے ہوئی، وہ بھی درست نہیں تھی۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔ یہ سوچ اس اعتبار سے غلط تھی کہ اسلام کے جو بنیادی عقائد ہیں، مسلمان انہیں ایمان کی بنیاد پر تسلیم کرتا ہے نہ کہ عقل کی بنیاد پر۔ مثلاً سرسید معجزات کی جو تعبیر کرتے تھے وہ مسلمانوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ سرسید جن مغربی افکار کی پیروی پر مسلمانوں کو مجبور کر رہے تھے ان افکار سے وہ اور ان کے پیرو حالی سرسری واقفیت رکھتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے دور میں علماء انگریزی اور مغربی فنون کے سیکھنے کے حق میں تھے ان کا سرسید سے اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب وہ مغربی فلسفے اور ادب پر سرسید کی طرح ایمان نہیں لاتے''۔

انتظار صاحب نے جہاں آپ کی کتاب کی تعریف کی وہاں یہ نکتہ بھی اٹھایا ''انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سرسید کی فکری خامیوں کے ساتھ علماء کی اس ثنویت کا بھی تجزیہ کیا جاتا کہ مغرب کے فنون سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بس ان کے فلسفہ اور ادب سے پرہیز لازم ہے''۔ اس اعتراض پر ان کا مؤقف تھا: ''میں نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ مغربی فلسفہ اور ادب کی جو آفاقی قدریں ہیں، ان کو مغرب سے لینے میں حرج نہیں۔ لیکن ان کی اندھا دھند تقلید نہیں ہونی چاہیے۔ اب ادھر جو دہریت کا فلسفہ ہے وہ تو ادھر نہیں چل سکتا تھا یا مادر پدر آزادی کا جو تصور ہے، وہ بھی ہمارے لیے قابل قبول نہ ہوتا۔ اس وقت ایک ایسا طبقہ تھا جو مغرب کا مخالف نہیں تھا لیکن حالی کی طرح ''چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی'' یا '' حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں'' والے رویے سے اختلاف رکھتا تھا''۔

فلمی دنیا کی معروف شخصیت گلزار کی شخصیت اور فن پر ان کی کتاب "The Art and Achievement of Gulzar" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تحسین کرنے والوں میں خوشونت سنگھ، انتظار حسین اور شمیم حنفی ایسے جید لوگ شامل ہیں۔ موخرالذکر دونوں اصحاب نے اپنی رائے میں اس کتاب کے اردو میں ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، ہم نے اس بارے میں ان سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا ''میرے پبلشر نے کچھ ہی عرصہ ہوا اطلاع دی ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، اب میں دوسرے ایڈیشن کے لیے اس میں تراجم اور اضافہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ کتاب کو اردو میں پیش کروں۔ گلزار پر کتاب کا خیال یوں سوجھا کہ میرے بھتیجے جہانگیر پرویز، جو ممبئی جاتے رہتے ہیں، وہ یہ بات میرے علم میں لائے کہ گلزار کو اپنے دینہ (جہلم) والے گھر کا فوٹو چاہیے جس پر میں دینہ گیا۔ ادھر جا کر معلوم ہوا کہ گلزار اپنے آبائی علاقے میں بڑے مقبول ہیں۔ بہت سے ایسے بزرگوں سے بھی ملاقات رہی جو ان کے خاندان کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ان لوگوں سے جو معلومات ملیں، میں نے ان کے نوٹس لیے۔ اس سے میرے ذہن میں اس خیال نے جنم لیا کہ کیوں نہ اس نابغہ روزگار شخصیت پر کتاب لکھی جائے۔ اب میں اس کام پر جت گیا۔ اس کام کے لیے معلومات کا حصول آسان نہیں تھا میں نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے پرانے رسالے اور مواد کو جمع کیا۔ گلزار نے مجھے کسی قسم کی گائیڈ لائن یا رہنمائی نہیں دی، ان کا تعاون بس اپنے خاندان کے بارے میں معلومات کی فراہمی تک ہی محدود رہا''۔ گلزار کی شخصیت سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تو پھر ظفر حسن نے گلزار کے تینوں شعری مجموعوں کا بھی اپنے مضمون ''گلزار کی شاعری'' میں تجزیہ پیش کیا۔

ڈاکٹر ظفر حسن کی اسے خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی بھر ان کا تعلق ایسے لوگوں سے استوار رہا جنہیں اپنے اپنے شعبوں میں مقام بلند نصیب ہوا۔ سائنس کے شعبے میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام سے ان کی نیاز مندی رہی۔ انہیں نوبل پرائز ملا تو ظفر حسن نے مبارکباد کا خط لکھا۔ پروفیسر عبدالسلام نے خط کا جواب دیا اور یوں دونوں کے درمیان ایک تعلق قائم ہو گیا۔ وہ جب کبھی بھی پاکستان آتے ان سے ملاقات ضرور کرتے۔ ایک بار ڈاکٹر ظفر حسن نے پروفیسر عبدالسلام کی توجہ ان کی منتشر تحریروں کی اشاعت کی جانب مبذول کرائی۔ نوبل انعام یافتہ اس سائنسدان نے عدیم الفرصت ہونے کا عذر کرتے ہوئے، ظفر حسن کو یہ کام خود سے کرنے کی ترغیب دلائی۔ یہ مان گئے اور اس منصوبہ پر کام کا آغاز کر دیا اور یوں 1984ء میں پروفیسر عبدالسلام کے مضامین کا مجموعہ "Ideals and Realities" کے نام سے شائع ہو گیا۔ اس کتاب کے لیڈ ایڈیٹر کے فرائض ڈاکٹر ظفر حسن نے انجام دیئے۔ یہ کتاب دنیا کی پچیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر ظفر حسن کی زندگی کا اجمالاً احوال یوں ہے کہ وہ 1938ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق چنیوٹ کے کاروباری گھرانے سے ہے۔ تقسیم کے ہنگام یہ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ 1953ء میں ایچی سن کالج لاہور سے سینئر کیمبرج کیا۔ 1954ء کے اوائل میں جرمنی چلے گئے۔ یہاں مکینیکل انجینئرنگ پلانٹ میں چار ماہ اپرنٹس شپ کے بعد وہ عازم امریکا ہوئے اور 1958ء میں ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی میں ڈگری لے کر ٹیکسٹائل انجینئر بن گئے۔ وطن واپس آ کر کراچی یونیورسٹی سے 1960ء میں ایم اے انگریزی اور دو برس بعد ایل ایل بی کا امتحان کامیابی سے پاس کیا۔ 1976ء میں انہیں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی مل گئی۔ ظفر حسن کی کاروباری زندگی ہمارا موضوع نہیں۔ یہ قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ وہ ٹیکسٹائل اور کاٹن کی صنعت سے متعلقہ تنظیموں کے اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں۔ ٹیکسٹائل اور کاٹن سے متعلقہ امور پر یہ ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں اور ان موضوعات پر ایک مدت سے انگریزی میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ظفر حسن زندگی سے مطمئن اور آسودہ ہیں۔ وہ اس حیات مستعار میں ملنے والی کامیابیوں پر

بقیہ صفحہ نمبر 14 پر

اماوس کی رات

بلراج ورما
Editor "Tanazur"
24-D, Pocket-III, Mayur Vihar
Phase-1, Delhi - 110091
Ph : 011-22718482

وہ اماوس کی ایک ایسی خوفناک رات تھی جس کا اندھیرا کسی قسم کی روشنی کو برداشت نہیں کرتا۔ چاروں اطراف تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور یہ طے کرنا مشکل تھا کہ ان کا اصلی رخ کون سا ہے یعنی وہ کدھر سے کدھر کی طرف چل رہی تھیں۔ بستی کے سارے چراغ گل ہو گئے تھے۔ یہ ایک بڑے طوفان کی آمد کے آثار تھے۔ چاروں طرف خوف و دہشت کا دور دورہ تھا۔ مردوں کی ہراساں آوازیں اور بچوں اور عورتوں کی چیخ وپکار نے سارا ماحول جہنم نما بنا دیا تھا۔

بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ بستی کا ہر گھر عناصر کے اس بے جا غرور سے متاثر ہو رہا تھا۔ چند ایک پکے اور مضبوط مکانوں کے علاوہ آس پڑوس کا ہر گھر تھوڑا بہت زخمی تھا۔ کئی گھروں کی چھتیں تک اڑ گئیں تھیں۔

مسافروں سے بھری بس بستی کی جانب بڑھتی ہوئی ڈگمگا رہی تھی۔ وہ کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری جانب لڑھکتی جا رہی تھی مگر ہوشیار ڈرائیور سٹیرنگ کو کچھ ایسی ہنرمندی سے تھامے ہوئے تھا کہ مسافر غم و غصہ سے نڈھال ہوتے ہوئے بھی اس کی جانب ایسے دیکھ رہے تھے گویا وہ کوئی جادوگر ہو جس میں قدرتی عناصر سے جوجھنے کا حوصلہ بھی تھا اور قوت بھی۔ خطرے کا احساس البتہ اندر ہی اندر سب کو کھائے جا رہا تھا اور وہ لوگ خدا کے حضور میں جھکے دعائیں مانگ رہے تھے۔ بچے اور عورتیں البتہ برابر چیخے جا رہے تھے۔ پھر جیسے قدرت نے ان کے نالہ و فریاد پر رحم کھا کر تیز و تند ہواؤں کا زور کچھ کم کر دیا۔

بجلی کڑکی، بادل پھٹا اور ایکدم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ڈرائیور نے مسکرا کر سواریوں کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھا۔ سب کی نگاہوں میں ایک انوکھا اور حوصلہ افزا یقین تھا۔ اب عورتوں اور بچوں کی بھی ڈھارس بندھی اور انہوں نے محسوس کیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔

ڈرائیور بس کو حرکت میں رکھے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ اندر بیٹھے مسافروں کو کچھ دکھائی نہ دیتا مگر انہیں یقین تھا کہ بس کچھوے کی رفتار چل کر بھی انہیں اپنی منزل تک پہنچا دے گی۔

بس کی رفتار یقیناً دھیمی تھی مگر وہ صحیح راستے اور صحیح سمت میں چل رہی تھی۔

مسافروں نے جتنی اور جس قسم کی اذیت برداشت کی تھی اس نے ان کے دلوں سے خطرے کا احساس تقریباً ختم کر دیا تھا۔

یکا یک ایک بڑے پیڑ کو سڑک کے بیچوں بیچ پڑا دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور سب مسافر باہر نکل آئے۔ اب وہ بارش میں بھیگ رہے تھے مگر مطمئن تھے کہ موت ٹل گئی تھی۔

ایک شخص نے جو غالباً اس علاقے کی ٹوپو گرافی سے مانوس تھا۔ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے اعلان کیا ''وہ دیکھو۔ ایک پرانا مندر''۔

سارے مسافر دوڑ کر مندر کی جانب لپکے۔

اس بدحواسی کے عالم میں کچھ ایک جو نسبتاً جوان اور طاقتور تھے دوسروں کو دھکے مار مار کر اور ادھر ادھر گرا گرا کر کچھ ایسے بھاگنے لگے گویا مندر کی سب سے اچھی اور محفوظ ترین جگہ پر قابض ہونے کا یہی ایک طریقہ ہو۔ کسی نے کسی کو اٹھا کر کھڑا کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

ڈرائیور اپنی سواریوں کی اس بے راہ روی سے ناخوش تھا۔ وہی ایک واحد شخص تھا اس بدحواس جگھٹے میں جو اپنی ذات سے لاپرواہ تھا مگر ہر سواری کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

یہ مندر کسی مسلمان صوفی پیر کی خانقاہ جیسا تھا جو آگے چھوٹی مگر پیچھے سے خاصی وسیع و عریض تھی۔ اور جس میں ایک ساتھ سو سے بھی زیادہ افراد پناہ لے سکتے تھے۔

وہ لوگ طوفان سے تو بچ گئے تھے مگر اب بھوک پیاس سے بچنے کی ترکیب پر غور کر رہے تھے۔ خانقاہ ویران پڑی تھی۔

ایک بے سہارا بچے کو اٹھا کر بس ڈرائیور خانقاہ میں ایسے داخل ہوا گویا وہی اس کا مالک کل ہو۔ اندر آتے ہی اس نے بلند آواز میں اعلان کیا۔

''ہم سب کو اب ایک دوسرے کا سہارا بننا ہے۔ جس کے پاس کھانے پینے کی اشیاء ہوں وہ انہیں چپکے سے نکال کر پیر کے اس تکیے پر رکھ دے۔ جو ایسا نہیں کرے گا میں نہ تو اس کی حفاظت کا ذمہ لوں گا نہ اسے آگے لے جانے کا''۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ معمولی سا آدمی سب سے زور آور اور قد آور دکھائی دینے لگا۔ جیسے وہ ان کا لیڈر ہو۔ ایک ایسا لیڈر جس کا حکم نہ ماننے پر خطرہ ہوگا۔

چند ایک حضرات کے علاوہ سب کے پاس کچھ نہ کچھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اشیائے خورد و نوش کا انبار لگ گیا۔

''اب نوجوان لوگ کنوئیں سے پانی نکالیں گے اور مستورات سب میں برابر برابر کھانے کی چیزیں بانٹیں گی۔ یاد رہے کہ یہ کھانا ہمیں کل شام تک ہر صورت میں بچانا ہے۔ اس سے تین حصے کرو اور آج کی شام صرف ایک ہی حصہ استعمال میں لاؤ''۔ کسی نے کسی قسم کی آنا کانی نہ کی۔ اور سب کام میں جٹ گئے۔ کچھ صفائی میں اور کچھ کھانے کی چیزوں کو اپنے لیڈر کے حکم کے مطابق بانٹنے میں۔ کل ملا کر وہ بیس تھے۔ بارہ مرد، تین عورتیں اور پانچ بچے۔ کھانے کے ساتھ پیکٹ تیار کر دئے گئے اور جب ہاتھ منہ دھو کر اور ضرورت کے مطابق پانی وغیرہ پی کر تیار ہو گئے تو کھانا بانٹ دیا گیا۔ بارش رات بھر برستی رہی مگر کھانے کے بعد سب یکے بعد دیگرے سو گئے۔ صبح اٹھے تو مطلع صاف تھا۔ اب مرد لوگ اور بس کا ڈرائیور سڑک پر لوٹ کر اس پیڑ کو ہٹانے میں جٹ گئے جس نے گئی شام ان کا راستہ روک لیا تھا۔

پیڑ کو ہٹا کر وہ لوٹے تو مستورات نے سب میں ان کے حصے کے پیکٹ بانٹ دیئے۔ ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔

''دیکھا آپ حضرات نے یک جہتی میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو تیسرا پیکٹ استعمال کر سکتے ہیں مگر بستی ابھی دس بارہ کوس دور ہے اور راستے میں اس پیڑ جیسی کوئی اور مصیبت ہمارا راستہ روک سکتی ہے لہٰذا یہ تیسرا پیکٹ آپ لیں تو بیشک لیں مگر اس کا استعمال ابھی نہ کریں۔ منزل پر پہنچ کر ہم اسے پرشاد کے طور پر کھائیں گے اور خدا کا شکر بجالائیں گے کہ اس نے ہماری جانیں بخش دیں''۔

پچھلی شام کو کھانا کھاتے وقت بھی مسافروں پر ایک غیر معمولی قسم کی افسردگی طاری تھی۔ کئی ایک کے نوالے تو آنسوؤں سے تر ہو کر حلق میں جاتے تھے مگر آج وہ صورت حال نہ رہی تھی۔ آج انہیں کھانا کھاتے ہوئے اسی لذت کا احساس ہو رہا تھا جو ہر بھوکے کو روٹی کے ٹکڑوں کو حلق میں اتارتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پورنیما اور راجندر بھی اس بس کے مسافر تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو شہر لے جانے کے لئے نندی گاؤں جا رہے تھے کہ مندرجہ بالا حادثے سے دوچار ہوئے۔ وہ اپنی نجی موٹر گاڑی میں بھی آسکتے تھے مگر جانتے تھے کہ ان کا بیٹا ہر اس سہولیت کے خلاف تھا جو عام لوگوں کو میسر نہ ہو۔

ناشتہ کرتے ہوئے وہ خدا کے کرشموں اور اس کی برکتوں کا تجزیہ کرتے جاتے تھے۔ راجندر نے کچھ سوچ کر کہا ''اچھا ہی ہوا جو ہم اپنی کار نہیں لائے ورنہ وہ راستے میں ہی کہیں الٹ پلٹ گئی ہوتی''۔

''ہم ریل گاڑی سے بھی تو آسکتے تھے۔ اطلاع کر دی ہوتی تو پتا جی گھوڑا گاڑی بھیج کر ہمیں اسٹیشن سے گھر لے جاتے''۔

پورنیما کے جواب سے شوہر کی تشفی تو نہ ہوئی مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

''تمہاری یہ فلسفیانہ چپی کبھی کبھی مجھے پریشان کر دیتی ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے تھے نا کہ جو کچھ ہوا اور جیسے ہوا اسے اسی طرح ہونا تھا۔ اسی میں بہتری تھی''۔

راجندر مسکرایا۔ ''ہمارے مقدر ان بیس افراد سے جڑے تھے اور ان سب کی حفاظت سے ان کی منزل مقصود پر لے جانا خدا کے فرشتوں نے طے کر رکھا تھا۔ ہم اپنی گاڑی میں آتے یا ریل سے سفر کرتے تو بھی وہی ہونا تھا یعنی جو مقدروں کے دیوتاؤں نے طے کر رکھا تھا۔ کار خراب ہو سکتی تھی۔ ریل پٹری سے اتر سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر کچھ بھی نہیں ہوا''۔

''کسی نہ کسی طرح تم ہمیشہ مجھے وہ سب کچھ یاد دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہو جو مجھے یوں بھی پچھلے بیس برسوں سے کھائے جا رہا ہے''۔

راجندر بولا ''تم میری بات کو سمجھے بغیر ہر وہ مطلب اخذ کر لیتی ہو جو تمہیں پسند ہوتا ہے۔ ابھی ابھی تم نے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی کچھ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ معمولی بس ڈرائیور ہم جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کا لیڈر بن جاتا ہے اور ہم اس کے اختیارات کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاید میں اپنی بات مناسب انداز میں سمجھا نہیں پا رہا۔ میرے مزاج میں جو دیہاتی اکھڑ پن ہے مجھے اس کا احساس ہے مجھے یہ شاید وراثت میں ملا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ میری ایکدم کھری اور سچی بات بھی ہمارے سننے والے کے دل میں بغاوت پیدا کر دیتی ہے اور وہ اکثر گمراہ ہو جاتا ہے اور وہ کر بیٹھتا ہے جو اسے نہ کرنا چاہیے۔ یہی بات میں سنوار کر اچھے پیرائے میں کہہ سکتا تو مجھے یقین ہے عام افراد تو درکنار وہ بات تم جیسی انفرادیت پسند خاتون کے دل میں بھی اتر جاتی''۔

''یہ شہر اور گاؤں کا فرق تمہارے لیے کوئی معنی رکھتا ہوگا میرے لئے نہیں۔ میں نے تمہاری شخصیت میں ایک بڑے عالم کو دیکھا تھا اور اب بھی دیکھتی ہوں کہ علم ایک ایسی چیز ہے جو کسی کو وراثت اور حق کے طور پر نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے کڑی تیاری صوفیوں جیسی توجہ اور محنت کشوں جیسی جفاکشی کی ضرورت ہوتی ہے جو تم میں ہمیشہ سے بدرجہ اتم موجود رہی ہیں''۔

''کیا فائدہ جو میں تمہیں ایک معمولی سے کام کے لئے راضی نہ کر سکا''۔

''تم اسے معمولی کام سمجھتے ہو۔ میں تمہارا کہنا مان لیتی تو میری نظروں میں وہ تعلیم و تربیت بے معنی ہو جاتی جس پر مجھے آج بھی ناز ہے''۔

''جو ہوا ہے اس کے باوجود؟''

''ہاں اس کے باوجود۔ کیونکہ میں تمہارے باباجی کو نہیں مانتی۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ایک عورت بھی۔ عورت کی جون میں آئی تھی تو مجھے اپنی تکمیل کے لئے ماں بھی بننا تھا۔ اور ماں کس ماحول میں بننا چاہیے یہ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تم سے بہتر جانتی تھی۔ میں نے جو کیا وہی مناسب تھا۔ نتیجہ اگر اچھا نہیں نکلا تو یہ محض ایک اتفاق ہے۔ مجھے دوبارہ موقع ملے تو میں پھر بھی وہی کروں گی جو میں نے کیا تھا۔ میری تربیت اور میرے سنسکار اب میرے خون میں رچ بس گئے ہیں اور ان کا احترام کرنا بھی اب میرے لیے لازمی ہو گیا ہے''۔

''میں نے اپنی تربیت اپنے سنسکار چھوڑ دیے اور تمہارے ہی نقطۂ نظر سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس کی وجہ سے میں جانتا ہوں مگر اعتراف کرنے کا گناہ گار اب نہ بنوں گا''۔

''آپریشن نے میری کوکھ کا نور سکھا دیا تھا۔ اب میں ماں نہیں بن سکتی۔ کیا تمہارے باباجی میرا وہ نور لوٹا سکتے ہیں''۔

''وہ کیا کر سکتے ہیں یہ میں نہیں جانتا''۔

''تو بات کو مزید طول نہ دو''۔

''بس اب چلنے کے لیے تیار تھی۔ وہ دونوں بھی چپ چاپ اپنی اپنی سیٹوں میں بیٹھ گئے۔ بیس کوس کا راستہ دس گھنٹوں میں طے ہوا کیونکہ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور کئی جگہ درختوں کی ٹوٹی شاخیں آڑے آرہی تھیں۔ اتنی مسافت پیدل بھی طے کی جا سکتی تھی مگر ایسا کرنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا کیونکہ دھند اور سیاہ کالے بادلوں کا اندھیرا بڑا ہی پرخوف و پرخطر تھا اور اِکّے دُکّے چلنے کے بجائے ایک ساتھ رہنے میں سب کا وشواس خاصا پختہ ہو گیا تھا۔

آخر کار منزل آ ہی گئی۔ نندی گاؤں آدھے سے زیادہ اُجڑ چکا تھا۔ اور لوگ چپ چاپ کھڑے آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے گویا عناصر کے اگلے حملے کے منتظر ہوں۔ غنیمت تھا کہ چند مویشیوں کے علاوہ کوئی ہلاک نہ ہوا تھا اگرچہ زخمیوں کی کمی نہ تھی۔

راجندر اور پورنیما کے داخل ہونے سے پہلے ان کی حویلی ایک ہسپتال میں تبدیل ہو چکی تھی جہاں لوگوں کی مرہم پٹی وغیرہ کی جا رہی تھی۔ پورنیما نے دیکھا کہ گوتم زخمیوں کی دیکھ بھال ایسے سلیقے سے کر رہا تھا جیسے وہ کوئی پیشہ ور ڈاکٹر ہو۔

''یہ مرہم پٹی کا ہنر اس نے کہاں سے سیکھا''۔

''غالباً اپنی ماں سے، سنا ہے ایک ہونہار ڈاکٹر ہیں''۔

''مجھ سے سیکھا''۔

''آپ ہی گوتم جی کی ماتا جی ہیں؟''

پورنیما کی آنکھیں چھلک آئی تھیں اور زبان پر تو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ اس سے جواب دیتے تو نہ بنا مگر وہ اندر ہی اندر اپنے بیٹے کے اخلاق سے گدگد ہو اٹھی۔

گوتم نے ماں باپ کے پاؤں چھوتے ہوئے مسکرا کر کہا: ''آپ حیران کیوں ہوتی ہیں۔ یہ سب تو میں نے ابھمنو کی طرح گربھ میں ہی سیکھ لیا تھا۔ آخر کار ایک کامیاب ڈاکٹر کا بیٹا ہوں''۔

پورنیا نے اسے سینے سے لگا لیا۔ سر جی بیٹے کے ساتھ اندر آئے تو اس نے بڑے احترام سے جھک کر ان کے پاؤں میں سر رکھ دیا اور تب تک وہیں پڑی رہی جب تک کہ انہوں نے اسے اٹھا کر سینے سے نہ لگا لیا۔ ان کے آنسوؤں سے پورنیا کی مانگ گیلی ہو کر لہو کی مانند اس کے ماتھے تک بہہ آئی۔

''میں آپ کی گنہگار ہوں دار جی اور اس بیجا حماقت کی سزا لینے آئی ہوں جس نے اس مقدس حویلی سے اس کی میراث چھیننے کا جرم کیا تھا''۔

دلوں کے راز جاننے والا تو وہ خدا ہے بیٹی! مگر جس طرح ایک درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ عین اسی طرح ایک انسان اپنے اعمال سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ تم گوتم کی ماں ہو اور یقین جانو بیٹی یہ بہت بڑا رتبہ ہے اور خدائے بزرگ و برتر کا ایک ایسا عطیہ ہے جس پر تم جتنا بھی ناز کرو بیجا نہ ہوگا۔ کارزار دنیا میں لڑے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہاں کامیابی کے لیے سردھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی روحانی چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں۔ علم بڑی چیز ہے پورنیا مگر عقل کی پاسبانی نہ رہے تو یہ آدمی کو غلط راستوں پر بھی لے جاتی ہے ہمارے ملک کی روایت کے مطابق عمر اور تجربہ علم سے بھی بڑے مانے جاتے ہیں۔ عالم لوگ اس حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں اور اپنے کم علم بزرگوں کے مشوروں کو نظر انداز کر کے ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ علم اور عقل دونوں کے تعاون سے ہی زندگی کے اوبڑ کھابڑ راستے ہموار کیے جا سکتے ہیں''۔

گوتم اپنے دادا کی تقریر سن رہا تھا۔ مسکرا کر بولا: ''آپ ممی کو اسی طرح بگاڑتے رہیں گے دادا جی تو مریضوں کو کون دیکھے گا۔ ان لوگوں کو میری ماں کی ہم سے زیادہ ضرورت ہے''۔

اگلے تین دن پورنیا نے دن رات ایک کر کے نندی گاؤں کے بچے بچے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ عورتوں اور بچوں کے لیے ماں جگدمبا تھی تو مردوں کے لیے ماں بھوانی بن گئی تھی۔

اتنا پیار اور خلوص بٹورا پورنیا نے کہ گوتم کے زخمی دل کی ساری خراشیں بھر گئیں اور اس نے اپنی ماں کو دل و جان سے معاف کر دیا۔

اس رات وہ دیر تک ایک ہی خواب دیکھتا رہا۔ صبح سویرے نور کے تڑکے اس نے حسب معمول اٹھنے کی کوشش تو کی تو مگر اپنے آپ کو ایک بڑے ملائم مگر ایسے دبیز رسے میں جکڑے ہوئے پایا۔ کوشش کے باوجود وہ اٹھ نہ سکا۔ اسے ڈر نہیں لگا جو موت سے بے نیاز و بے پرواہ ہو۔ ڈر یا خوف اس کے پاس آ بھی کیسے سکتے ہیں!

وہ اس کی ناف سے ذرا اوپر تنا کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں گوتم کی آنکھوں میں گھورے جا رہی تھیں۔

گوتم مسکرایا: ''میں نے اپنی ماں کو معاف کر دیا ہے آپ بھی کر دیجیے۔ وہ اپنے سنسکاروں سے بندھی تھی۔ اپنی تربیت اور اپنی تعلیم سے بندھی تھی لہٰذا مجبور تھی''۔

مگر وہ اُسے ویسے ہی چپ چاپ گھورے جا رہا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی کچھ کہہ رہا ہے۔ آواز دھیمی مگر صاف تھی۔

میں نے تیرے بدن کا وہ سارا زہر چوس لیا ہے جس نے تیرے بدن کے نچلے حصے کو ناکارہ کر رکھا تھا۔ اب تم چند ہی دنوں میں ایک لیجنڈری گریک گاڈ (Legandry Greek God) کی مانند چھ فٹ کا فولادی بدن بن جاؤ گے۔ مگر میں اس کے عوض تم سے اس حویلی سے اور اس دنیا سے رہائی مانگتا ہوں۔ میں نے پورے ایک سو بیس سال اپنے دوست کے کنبے کی دیکھ بھال کی ہے۔ اب میں بہت تھک گیا ہوں۔ اُوپر میرے ابا کی حویلی میں میری ماں میرا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے اس کے پاس پہنچا دو''۔

''یہ میں کیسے کر سکتا ہوں''۔

''یہ صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ مجھے قتل کر کے''۔

''یہ میری فطرت کے خلاف ہے کہ اپنے خاندان کے محافظ اور سب سے قابل احترام بزرگ کے ساتھ ایسا بیجا سلوک کروں''۔

''تم اپنے خاندان کی آخری پیڑھی ہو، وعدہ کرو کہ تم اس شجرے کو آگے بڑھاؤ گے۔ اب تمہارے بدن میں وہ طاقت آ گئی ہے جو تم سے عورت کے بدن کا تقاضا کرے گی اور تم اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مجبور ہو جاؤ گے''۔

''تم اب ایک بھرپور مرد ہو اور اتنے تندرست توانا اور خوبصورت کہ آسمان کی اپسرائیں بھی تمہاری چاہت پر مجبور ہو جائیں گی''۔

''میں دیکھنے میں خوبصورت دکھائی دیتا ہوں اسی لیے نہ؟''۔

''اسی لیے بھی''۔

''میں اس خوبصورتی کو ایک دم بدنما کر دوں گا تاکہ کوئی میری جانب نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکے''۔

''کچھ لوگ گہری نظریں رکھتے ہیں وہ دلوں اور روحوں میں جھانک کر دیکھ سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تم اپنا چہرہ بگاڑ سکتے ہو اپنی فطرت اور اپنی آتما کے حسن کو مجروح نہیں کر سکتے۔ اور وہ لوگ جن میں روحوں میں جھانکنے کی صلاحیت ہوتی ہے ظاہری خد و خال کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دیتے''۔

''میں ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کروں گا''۔

تو اب ایسا نہیں کر سکے گا کیونکہ تیرے مرشد و رہبر دادا سردار شمشیر سنگھ جی اب اس دنیا میں نہیں رہے''۔

''تمہاری ماں کی کوکھ کا نور جل چکا ہے اور تمہارا باپ کسی بھی قیمت پر دوسری شادی نہ کرے گا''۔

''تم اب اپنے قبیلے کے شجرۂ نسب کی آخری کڑی ہو۔ تم اسے آگے بڑھانے کا وعدہ کر لو تو میں اپنے فرض سے سرخرو ہو جاؤں گا۔ پھر میرے قتل پر تمہیں کسی قسم کی پشیمانی بھی نہ ہوگی''۔

یکا یک باہر سے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر گوتم اٹھ بیٹھا۔

باہر بڑے دالان میں اس کے دادا جی کی لاش رکھی تھی جس کے سرہانے ایک ٹمٹماتا ہوا دیا رکھا تھا۔ پورنیا، راجندر اور گھر کے نوکر چاکر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

اس کو بابا جی کے کمرے سے باہر نکلتے تو سب نے دیکھا مگر کسی کو بھی خیال نہ آیا کہ وہ پہلے والا گوتم نہ تھا۔ اس کی ٹانگیں ایک دم سیدھی ہو گئی تھیں اور گھٹنوں کی غیر معمولی سوجن بھی ایک دم غائب تھی۔

وہ حسب معمول اب ایک عرصے سے بابا جی کے کمرے میں ہی سوتا تھا مگر اس رات والا عجیب و

غریب سپنا اسے دوبارہ کبھی دکھائی نہ دیا۔

گوتم کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ راجندر اور پورنیا حویلی کو خالی کر کے فروخت کرنے کے منصوبوں میں مشغول تھے۔ ہر وہ چیز جو ان کی نظروں میں اہم، کارآمد یا قیمتی تھی پہلے ہی سے شہر میں منتقل کر دی گئی تھی۔ یہ پروگرام وہ دونوں کچھ ایسے سلیقے سے سرانجام دے رہے تھے کہ گوتم کو بھنک بھی نہ ملی اور قصر سرداراں تقریباً خالی ہو گیا۔

گوتم کا سارا وقت بابا جی کے یا خاندانی دستاویز والے کمرے میں صرف ہوتا تھا۔ اس نے صبح کی سیر بھی ترک کر دی تھی۔ دادا جی تھے تو سیر کا مطلب، کچھ......تھا۔

اُس رات وہ جیسے ہی سونے کے لئے باباجی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ پلنگ پر اس کی ماں لیٹی ہوئی ہے۔

پوچھنے پر پورنیا نے بتایا کہ وہ دن کو اکثر اسی کمرے میں وشرام کرتی ہے۔ آج وہ چاہتے ہوئے بھی وقت پر اُٹھ نہ سکی تھی۔

ماں بیٹا سٹ کر بیٹھ گئے۔ پھر ماں نے گوتم کو گود میں بھر لیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔

میں جب جب ادھر آئی ہوں ایک ہی آواز بار بار سنی ہے۔

''مجھے آزاد کرادو — مجھے آزاد کرادو — مجھے آزاد کرادو — حیرت ہے اس آواز نے مجھے چونکا تو ہر بار دیا مگر میں ڈری ایک بار بھی نہیں''۔

قصر سرداراں میں یہ ان لوگوں کی آخری رات تھی۔ انہوں نے گوتم کو بھی شہر لوٹ جانے پر راضی کر لیا تھا۔ صبح نور کے تڑکے سے چند لمحے پہلے حویلی کے مکینوں کو گھٹن کا سا احساس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ساری حویلی چراغاں تھی۔ روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیانے لگیں تو پتہ چلا کہ حویلی آگ کی لپٹوں میں آتی جا رہی ہے۔ باباجی اور دستاویز والا کمرہ جو غالباً سب سے پہلے سپردِ آتش ہوئے تھے جل کر راکھ ہو چکے تھے اور آگ اب اوپر والی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

سب لوگ آگ اور دھوئیں سے بچتے بچاتے حویلی سے باہر نکل آئے۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جب اطمینان ہو گیا کہ سب محفوظ نکل آئے ہیں تو چپ چاپ نندی گاؤں کے دوسرے افراد کی طرح علاقے کی سب سے پرشکوہ عمارت کو مسمار ہوتے دیکھنے لگے۔ بڑا ہی عجیب منظر تھا۔ ایسی وسیع و عریض حویلی کو اس بھیانک آگ سے بچانے کا کوئی راستہ یا طریقہ کسی کو سوجھ نہ رہا تھا۔

اچانک لوگوں نے کسی عورت کی بلند آواز چیخ سنی۔ وہ اتنی خوف زدہ اور بلند تھی کہ دہشت سے سارا گاؤں کانپ اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ چیخ سارے علاقے کا احتجاجی نعرہ تھا۔ کیونکہ حویلی کے سرداروں کے اچھے اوصاف واخلاق نے گاؤں کے ہر فرد کو اپنا دوست اور ہمدرد بنا لیا تھا۔

یہ پورنیا کی چیخ تھی جو اپنے بیٹے کو اپنے مابین نہ پا کر اس کے حلق کو چیرتے ہوئے نمودار ہوئی تھی۔ اور تب لوگوں نے دیکھا۔ حویلی کی سب سے اونچی منزل کی چھت پر گوتم ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی مشعل لیے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان ایک بت کی مانند کھڑا تھا۔

آگ اب اس کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھی مگر آگ کی لپٹوں سے بے نیاز و بے خوف کھڑا چلا رہا تھا۔

''یہ حویلی آپ کی نہیں، میری بھی نہیں۔ جس کی تھی وہ اب نہیں ہے۔ اسے بیچنے یا خریدنے کا حق صرف اسی کو تھا۔ آپ نے جو چیزیں اٹھوا کر شہر بھجوا دی تھیں صرف وہی آپ کے پرکھوں کی ملکیت تھیں جو آپ نے لے لی۔ قصر سرداراں کی کہانی آج ختم ہو گئی۔ اس کی آخری نشانی یعنی میں بھی اب اسی کے ساتھ ختم ہو جاؤں گا''۔

پورنیا چیخی: ''نہیں''۔

راجندر بھی بیوی ہی کی طرح چیخا: ''نہیں بیٹے نہیں''۔ اور تب لوگوں نے دیکھا کہ چھت کا وہ کنارہ جس پر حویلی کا آخری وارث اپنے بری طرح سے جھلسے ہوئے بدن کے ساتھ کھڑا غالباً اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ نیچے، حویلی کے ساتھ لگے جوہڑ میں جسے گاؤں کے مرد و زن بچوں اور مویشیوں کی ضرورت کے لیے حویلی کے مالکوں نے عرصہ پہلے کھدوایا تھا، جا گرا۔

یہ جوہڑ جو کسی زمانے میں شاید ایک خندق یا کھائی کے طور پر حویلی کے چاروں طرف بنوایا گیا تھا وقت کے ساتھ ساتھ مٹی سے بھرتا چلا گیا تھا۔ اب اس کا کچھ حصہ صرف حویلی کے پچھواڑے کی جانب ہی بچا رہ گیا تھا۔ غالباً زیادہ گہری ڈھلوان کی وجہ سے، ہوسکتا ہے کبھی اسے پانی سے بھرا رکھنے کے انتظامات بھی رہے ہوں گے مگر اب ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ یہ جوہڑ جسے گاؤں کے لوگ نندی گاؤں کا تالاب کہہ کر بلاتے تھے اب برسات ہی میں بھرتا تھا چونکہ کافی گہرا تھا اس لئے اس کا پانی کبھی سوکھتا نہ تھا۔ پچھلی طوفانی بارش نے تو اسے لبالب بھر دیا تھا۔

گوتم گرا تو منہ کے بل تھا مگر اسے کوئی بڑی چوٹ نہ آئی۔ گاؤں کے نوجوانوں نے جو تالاب میں اپنے مویشیوں کے ساتھ تیرنے بھی آیا کرتے تھے کود کر گوتم کو کسی طرح کھینچ کھانچ کر پانی سے باہر نکال لیا۔

اس دوران لوگوں نے ایک نیا کرشمہ دیکھا۔

ایک چھوٹا سا پرندہ اور ایک چھوٹا سا پلی نہ جانے کہاں سے گوتم کے پاس چلے آئے تھے۔ عام طور پر پرندوں اور کتوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا جاتا ہے۔ مگر پورنیا نے ایسا نہ ہونے دیا۔ پرندے میں اس نے گورو مہاراج کا باز بہادر اور کتے میں اسے مہابھارت کے راج کمار یدھشٹر دکھائی دیے۔

گویا باز بہادر قصر سرداراں کے باباجی تھے اور کتا گوتم کے پیارے دادا جی کی مقدس آتما!! ●●

پردہ اٹھتا ہے

نیلم احمد بشیر
28 B,Lane V,
Cavalry Ground
Lahore Cantt. (Pak)
chaarchand@yahoo.com
Ph 03224885884

ان دنوں میں اپنی بیٹی عنبر کے پاس امریکہ کی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ ورجینیا وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کار کی نمبر پلیٹوں پر لکھا ہوتا تھا "ورجینیا از فار لورز" اب میں نے حالیہ سالوں میں نمبر پلیٹوں پہ ایسا کچھ لکھا نہیں دیکھا، شاید اس لیے کہ امریکہ کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ایسے رومانی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پہ کرنا مناسب ہی نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو "فن اینڈ گیمس" کی جگہ دہشت گردی، جنگوں، ڈیزی کٹر حملوں اور مسلم Militants جیسے عوامل سے جو نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔ ورجینیا چونکہ امریکہ کے کیپٹل شہر واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ہوئی ریاست ہے اس لیے اس پُر جمال، پُر وقار صاف ستھرے شہر کا سنجیدہ کلچر اس پہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔ پُرشکوہ عمارات، کشادہ سبز باغات، ٹریفک کے منظم بہاؤ والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے حاکم دنیا، کم تر ملکوں کے لیے بد صورت فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

میری بیٹی عنبر یہاں کے ٹاؤن کرسٹل سٹی کی ایک یونیورسٹی میں ایڈمنسٹریشن جاب کرتی ہے۔ اسے اکثر اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں اس کی تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ کر دیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست کھانا کھلایا۔ وہ ہمیشہ ہی مجھ پر دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے۔ شام کو جب کام سے واپس آتی ہے تو ہم دونوں ماں بیٹی چہل قدمی کے لیے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی شان والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ و جلال کو دیکھ کر ہمیشہ سوچتی ہوں کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے، کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنا ایمان بنایا ہوتا تو آج یوں اپنا دیس چھوڑ کر پردیسیوں میں بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوتے۔

پچھلے کچھ دنوں سے شہر ڈی سی میں انڈین فلم اسٹار کے ایک انٹرٹینمنٹ شو کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پہ اشتہار چل رہے تھے، انٹرنیٹ پہ ٹکٹ بک رہے تھے اور ہر طرف پروموشن پوسٹرز لگے دکھائی دے رہے تھے۔ 4 ستمبر کو "Temptation 2004" کے نام سے کیا جانے والا یہ شو کافی پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ "کیوں نہ ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں؟" عنبر نے مجھ سے کہا اور سو سو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بہت خوش تھی۔ میں نے بہت سال پہلے امریکہ میں اسی قسم کا امیتابھ بچن شو دیکھ رکھا تھا کہ تب امیتابھ کا دور تھا۔ وہ جوان تھا اور ہم نوجوان، لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم کا کوئی انڈین شو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی یہ سوچ کر خوشی خوشی حامی بھر لی کہ "اچھا ہے چلے چلتے ہیں مزا رہے گا۔" ہم واشنگٹن ڈی سی کے بڑے سے اسٹیڈیم نما ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے انڈین فلمیں ہم سب کی زندگی کا اہم حصہ بن چکی ہیں اور ہر گھر میں ذوق شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ انڈیا، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ، امریکہ جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں انڈین فلمیں تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اور یہی حقیقت ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اپنی زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں انڈین فلموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ آج انڈین فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں چلتی ہیں۔ ہالی ووڈ کے ہم پلہ بالی ووڈ سینما نے بھی دنیا بھر میں اپنے مداحین پیدا کر لیے ہیں اور اسی لیے ان کے فلم اسٹارز کے شو اتنی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس شو کے مین فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زنٹا، رانی مکر جی، پریانکا چوپڑہ کے نام تھے مگر سب سے زیادہ جس نام کے لیے لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے وہ تھا سپر اسٹار اداکار شاہ رخ خان۔ سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے جانے والے شاہ رخ آج اپنے مداحوں کے لیے نمبر ون کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی اداکاری، شخصیت اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے کے لیے گھر سے نکل پڑے، عنبر کا خیال تھا کہ پارکنگ کے مسئلہ کی وجہ سے ہم لوگ لوکل ٹرین سے سفر کریں تو بہتر ہوگا۔ یہی سوچ کر ہم ٹرین اسٹیشن کی طرف چل دیئے، نیویارک شہر کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور اسٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ اسٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ میں بنے جیومیٹریکل ڈیزائن کو سراہتے ہوئے ہم کچھ ہی دیر میں ٹرین میں جا سوار ہوئے جس نے ہمیں ایم سی آئی سنٹر کے بالکل قریب ہی اتار دیا۔

چند منٹوں کی واک کے بعد ہم لوگ بڑے سے اس سنٹر کے پاس پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کی کنسرٹس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑک پہ ہم جیسے لوگوں کا جنہیں امریکہ میں "دیسی" کہا جاتا ہے ایک ہجوم تھا جو شو کے لئے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے بوڑھے، بچے، فیشن ایبل لڑکے، لڑکیاں سبھی کے چہرے شو کے خیال سے دمک رہے تھے۔ کوئی کسی کو ہیلو ہائی کہہ کر گلے مل رہا تھا تو کوئی موبائل فون پہ کسی آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا کہ امریکہ میں کہیں بھی آنا جانا ہو ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگ شلوار، قمیض، ساڑھیاں، پینٹ شرٹس، کڑھائی والے کرتے، پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آ رہے تھے اور خاموش امریکی سنڈے، جاندار، دیسی اتوار میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ہم تینوں عمارت کے اندر جانے کے بارے

میں سوچ ہی رہی تھیں کہ یک دم ہماری نظر دو خواتین پر پڑی جو ہال میں جانے کے لیے اسی طرف آ رہی تھیں، دونوں پاکستانی سی لگ رہی تھیں۔ ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا جو لڑکھڑا کر رک رک کر چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں فرح لپک کر ان کی طرف بڑھی، سلام کرنے کے بعد کہنے لگی'' باجی یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں'' مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور والی ؟ اور یہاں ؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آ گئی تھی ؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟

'' کیا سہانہ یہاں آئی ہے؟''۔ مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ فرح کے شہر بالٹی مور کی رہنے والی تھی جس کے بارے میں فرح دکھ سے بتایا کرتی تھی کہ وہ کینسر کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضاء کاٹ ڈالے تھے مگر کینسر اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا اور سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ اس کا علاج بالٹی مور کے چوٹی کے ہسپتالوں میں ہو رہا تھا مگر ڈاکٹر بے بس ہو چکے تھے اور اب انہوں نے اسے لا علاج قرار دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ ایک مرحلے پہ انہوں نے اس کے کیس کو کینسر سٹڈی کے لئے ریسرچ کالج میں بھی بھیجنا چاہا مگر سہانہ اور اس کا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ سہانہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ چار چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ نا امید نہیں تھی۔ ۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا'' شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں، شاید انہیں ایک بچوں کی ماں پہ رحم آ جائے''۔ وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی لہٰذا ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں ہی کیا کرتی تھی۔ فرح بتاتی تھی کہ سہانہ کس قدر زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ لڑکی تھی۔ اسے اچانک ہی اپنے مرض کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ اب زندگی کے دیئے کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ عمر کی نقدی ختم ہوتی جا رہی تھی مگر حسرتیں تھی ایسی کہ ان کا انبار لگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ مشکل سے سانس لیتی تھی مگر پھر بھی گھر میں بچوں کے لئے کھانا بناتی، لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی، جتنے دن اپنے بچوں کے کام آ جاؤں اچھا ہے۔

اپنی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے اس میں وطن واپس جا کر ماں باپ، بہن بھائیوں کو بھی آخری بار ملنے کی شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی لیکن وہ پاکستان نہیں جا سکتی تھی اور واپس وہ ضرور آنا چاہتی تھی اور اپنی زندگی کی باقی ماندہ پونجی اپنے بچوں اور شوہر پہ نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ گھر بار امریکہ میں تھا اور دوسری طرف اس کے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے۔ وہ ہر قیمت میں اس سے ملنا چاہتے تھے مگر سر پٹخ رہے تھے۔ کیونکہ امریکن قونصلیٹ سے انہیں ویزا جاری نہیں ہو رہا تھا کہ اب امریکیوں کو تھرڈ ورلڈ کے مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا، ان کی بھرپور کوشش یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے قدم امریکہ کی سرزمین سے دور ہی رہیں۔

امریکہ ایک آکٹوپس کی طرح اپنے خوبصورت سہل پرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جب جکڑ لیتا ہے تو اس کی مضبوط ٹانگوں میں پھنس کر انسان بے بس ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ اس وقت تک واپسی کی سب کشتیاں جل چکی ہوتی ہیں۔

سب دوست احباب سہانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے۔ اس کی خیریت دریافت کرتے اور ڈرتے اس دن سے جب سہانہ کی جگہ اس کا میاں فون اُٹھائے اور کہہ دے کہ اب سہانہ یہاں نہیں رہتی۔

موت ایک وحشی ڈائن کی طرح ہڈیوں کے بالن کے بھڑکتے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سہانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشہ دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اُٹھنے والا اور ایک گرنے والا تھا۔ '' تم یہاں کیسے! تمہاری طبیعت کیسی ہے''۔ فرح نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ '' طبیعت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ انجوائے کر لوں!'' اپنے گنجے سر پہ دوپٹے کو ٹکانے کی کوشش کرتے ہوئے سہانہ مسکرانے لگی۔

ہاں تو اور کیا میں نے بھی '' اگر تمہارا جی چاہ رہا ہے تو شو دیکھنے چلے جاتے ہیں ذرا طبیعت ہی بہل جائے گی۔ ہم تو اپنی سہانہ کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے ہیں بھئی''۔ سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم سب دھیرے دھیرے ہال کے اندر جانے لگے۔

'' کیا تم اتنی دیر آرام سے بیٹھ لوگی؟'' فرح نے پھر اپنی دوست سہانہ سے پوچھا۔ '' جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ پھر اُٹھ کر چل دیں گے اور کیا۔ چلے تو جانا ہی ہے۔'' سہانہ کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میرے کلیجے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ ہماری سیٹیں ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پہ نہ تھیں۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے کو دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھا۔ ہم انڈین فلموں کے مقبول ترین فنکاروں کو دیکھنے جا رہے تھے اور میں بھی خوش تھی کیونکہ عمر رسیدہ ہو جانے کے باوجود موقع کی مناسبت سے میں بھی بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے میں ہی عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں گے اور میں اکیلی کھڑی رہ جاؤں گی۔ بالآخر شو شروع ہو گیا۔ پردہ اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر آغاز پر خوشی کا اظہار کیا۔ سکرین پہ فنکاروں کی شو کے لئے تیاری کی ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ وارم اپ ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ انسانی جذبات کے حوالے سے تھیم کو تشکیل کیا گیا تھا۔ لہٰذا جتنے فنکار اسٹیج پر آتے گئے ان کے آنے سے پہلے ان کے ساتھ ایک جذبہ کا نام اسکرین پر ابھرتا اور غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلے آنے والے فنکار ارجن رام پال تھے جن کے لیے جذبہ رشک Envy تجویز ہوا تھا اور انہیں دیکھا تو واقعی یقین آ گیا کہ ان کے لئے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہائے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے اس نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا اور حاضرین کی پرزور ستائش اس بات کی مکمل گواہی دے رہی تھی۔ ارجن نے اپنے چند مقبول فلمی گانوں پر ایک ڈانس گروپ کے ساتھ مہارت سے ڈانس کیا اور مداحوں کی تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پر لکھے اگلے جذبے کا نام Passion تھا۔ جیسے ہی یہ ایکٹ شروع ہوا سارا منظر گلابی گلابی سا ہو گیا اور مدھر دھنیں فضا میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنٹا آ رہی ہے لہٰذا انہوں نے

اس بھولی صورت کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت مختصر جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور گانوں پر ڈانس کیا اور لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔ اب کی بار جو پردہ گرا تو نئے عنوان کے ساتھ اٹھا۔ Lust لکھا دیکھتے ہی لوگوں کی حس ظرافت پھڑ کنے لگی اور سب ہنسنے لگے۔ اس جذبے کی نمائندگی کے لئے خوبصورت نوجوان اداکارہ پریانکا چوپڑہ اور سیف علی خان منظر پہ نمودار ہوئے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرنے لگے۔ پریانکا نے بہت اچھا گایا اور ڈانس کیا، سیف نے شاہکش انداز میں گٹار بجائی اور حاضرین سے مخاطب بھی ہوئے۔ لڑکیاں بار بار We love you Saif کہتیں تو وہ بھی فلائنگ کس پھینک کر جواب دیتے۔ I love you too اس سے ہال میں ایکسائٹمنٹ بڑھتی چلی جاتی۔ لوگ خوش ہو رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے رنگ و روشنی کا ایک حسین احساس تھا جس کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ رانی مکھر جی اسٹیج پر آئیں تو ان کے مداحوں نے انہیں بھی خوب سراہا اور کئی لوگ ان کے ڈانس کے ساتھ کھڑے ہو کر ڈانس کرتے نظر آنے لگے۔

میں نے کنکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا جو عنقریب ایک جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہہ میں تبدیل تو ہونے والی تھی مگر کائنات کے نظام میں اہمیت رکھتی تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کے دروازے کو نیم وا کئے ہوئے بیٹھی تھی اور مشتاق آنکھوں سے باہر گلی میں کھیلے جانے والے تماشہ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لیے نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔

سیف علی خان کے بعد پستہ قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مکھر جی سٹیج پر آئیں اور کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمتکار دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا، لوگ اس کے رقص پر جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ ان سب فنکاروں کی رخصتی کے بعد ہال پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا، سہانہ کی بھابی نے اپنی نند کی طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا ”چلیں تم تھک گئی ہو گی؟“

”نہیں، جتنی دیر بیٹھ سکی بیٹھوں گی“ سہانہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور سٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار گھوم لینے کے خیال سے خوش تھا اوا ندھیرے ہال میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پردے پہ جیسے ہی لفظ محبت "Love" لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا اب ون اینڈ اونلی شاہ رخ خان آ رہے ہیں۔ وہ شاہ رخ خان جس کے لیے وہ کب سے منتظر تھے۔ سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو سٹیج پر اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ سکرین پر اتنا خوبصورت دکھنے والا یہ مقناطیسی کشش کا حامل سٹار کافی درمیانی شکل صورت اور قد بت کا مالک تھا۔ اس کی مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری اور ہر دلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ آج شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنے فلم بین مداحوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں سب کچھ خوبصورت اور ممکن ہوتا ہے۔ الجھنیں سلجھ جاتی ہیں اور حقیقتوں کی تلخیاں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا تو اسی لمحہ چھت سے ٹپکتے ہوئے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے سماں مزید رومانی ہو گیا۔ لڑکے، لڑکیوں نے ایکسائٹمنٹ کے مارے چیخیں مارنا شروع کر دیا تو شاہ رخ نے مائک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں شروع کر دیں اور باتوں باتوں میں جب کسی بات پہ بے ساختہ انداز میں ماشاء اللہ کہا تو اچھا لگا۔ وہ حاضرین سے باری باری پوچھتے چلے گئے۔ ممبئی سے کوئی ہے، یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں؟“۔ تو سب پاکستانیوں نے زور شور سے تالیاں پیٹیں جن میں میں بھی شامل تھی۔ اس وقت شاہ رخ مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا کہ سنا ہے شاہ رخ پاکستانیوں سے بھی پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہئے کیونکہ پاکستانی بھی تو بڑے ذوق شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو اسٹیج پر بلایا تو انہوں نے وفور جذبات میں شاہ رخ کو گود میں ہی اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ سارا ہال ہنس ہنس کر داد دینے لگا، لگتا تھا اس لمحے ساری دنیا خوش تھی اور دکھ نام کے کسی جذبہ سے آشنا نہ تھی۔ سہانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اسے اس وقت کہاں یاد تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں تماشہ ختم ہو جائے گا، روشنیاں گل ہو جائیں گی اور سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ پیش منظر، پس منظر میں تبدیل ہو جائے گا اور نظام کائنات چلتا رہے گا۔ کیا شاہ رخ خان کو دیکھنا سہانہ کی کوئی آخری خواہش تھی؟۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اپنے ایکٹ کے دوران شاہ رخ خان نے مختلف لوگوں کو اسٹیج پر بلایا اور اپنے ساتھ آئٹم میں شامل کر کے ان سے باتیں کیں ان کے ساتھ ڈانس کیا۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجواؤں جس پہ لکھا ہو کہ تمہاری ایک فین بستر مرگ سے اٹھ کر آج تمہیں دیکھنے تمہارے فن کی پزیرائی کرنے کو یہاں چلی آئی ہے۔ اس سے ذرا مل لو، اس کے ساتھ بات کر لو، اسے کوئی جھوٹی ہی تسلی دے دو، شاید اس طرح اس کی زندگی کے گنے چنے لمحوں میں ایک آدھ لمحے کا ہی اضافہ ہو جائے، وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہو سکتا ہے، مگر میں اپنی اس پاگل خواہش کو دل ہی دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ اسٹیج پہ کھڑے زندگی سے بھرپور دلکش شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پیغام پہنچانا ممکن نہ تھا، لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سکیورٹی کے لیے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی بیریئر اور ہال کا نظم و نسق سنبھالنے والے موٹے موٹے بڑے ڈیل ڈول والے بلیک سکیورٹی گارڈز، ان سب کے ہوتے ہوئے ایک ننھی سی پرچی پہ لکھا ہوا کوئی پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچایا جا سکتا تھا؟۔ کچھ ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو ایک لمبے سے پہیوں والے سٹینڈ پر کھڑا کر کے حاضرین کے بالکل قریب سے گذرنے کا موقع دیا جس پر لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سہانہ بھی کمزور ہاتھوں سے تالی بجا رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ہلاتا، فلائنگ کس پھینکتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ دو بجھتے ہوئے دیوں میں کتنی خوبصورت جوت جل اٹھی ہے۔ اسے تو بس یہ پتہ تھا کہ اسے نے چاہنے والوں کو خوش کرنا ہے ان کا دل لبھانا ہے۔ اس لیے دوبارہ اسٹیج پر نمودار ہوا اور اب کی بار اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر ڈانس کئے اور ڈائیلاگ بولے۔ اس کے مزیدار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں

ایکسائٹمنٹ کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخوں اور کہوں، شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو ...... وہ جا رہی ہے۔ تمہیں وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی ...... کل وہ پتہ نہیں ہو نہ ہو، مگر ایک ہیجانی شور میں میری آواز اسے کیسے سنائی دے سکتی تھی اس لیے میں خاموش رہی۔ اسٹیج پر زندگی تحرک رہی تھی حاضرین کی رگوں میں بہنے والے خون کی قوت بڑھا رہی تھی اور موت ایک سیٹ پہ بیٹھی محفوظ ہوتی کسی کی ختم ہوتی سانسوں کی ریز گاری گن رہی تھی ''ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جا کے بتائے؟'' میرے دل نے ایک اور چیخ ماری اور میں پھر خاموشی سے شو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہو گیا اور ہم سب ہال میں سے باہر نکلنے لگے۔ سہانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ کہیں رش میں اسے ٹھوکر نہ لگ جائے۔

''برا حال ہے چلا بھی نہیں جا رہا لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا، کتنا مزہ آیا......'' سہانہ کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''کئی بار پوچھا چلنا ہے؟ مگر توبہ کریں جی یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی''۔ سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کے بازو کو تھپتھپایا، میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر نیچے جھک گئیں۔ یوں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے اور باقی رہ جانے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پر صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟۔

سہانہ شاہ رخ سے نہ مل سکی اور زندگی سہانہ کو تو کیا ہوا؟۔ کسی تعلق کو قائم رکھنے یا ثابت کرنے کے لیے کیا کسی کا کسی سے ملنا ضروری ہوتا ہے؟ ایک ہی گلیکسی کے سیارے اپنے اپنے مدار پر تیرتے رہتے ہیں، ایک دوسرے پر فاصلہ رکھتے ہیں مگر ان کا ایک دوسرے سے تعلق تو پھر بھی ہوتا ہے۔ ہم سب کائنات کے کمسن گھیری کے ناچتے ہوئے بگولوں میں اڑتے ہوئے تنکے ہیں۔ آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کے بائیسکوپ میں جڑے شیشوں میں قید ہیں، یہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے جہاں پردہ گرتا ہے پھر اٹھتا ہے، کردار انٹری دیتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ شو کو تو چلتے رہنا ہوتا ہے۔ جنم اور مرن کھلے سمندر میں تیرنے والی دو کشتیوں کا نام ہے۔ ہم خوشی مناتے ہیں جب جنم کشتی اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اس سے بے نیاز کہ راستے میں اسے کتنے طوفانوں، جھکڑوں بگولوں کا سامنا کرنا ہوگا، ہم سوگ مناتے ہیں جب یہ کشتی کنارے جا لگتی ہے حالانکہ اس وقت ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ کٹھن سفر ختم ہوا۔ مسافر نے منزل کو جا لیا اور اب اس کے نصیب میں آرام ہی آرام ہے۔

میں سہانہ کے لیے سوگوار نہیں ہوں، وہ پنہاں ہو گئی تو کل یقیناً کسی لالہ و گل میں نمایاں ہو جائے گی۔ باغ حیات میں چلتی باد صبا مہکتی سرسراتی ہوئی جب کسی غنچۂ نو کے رخسار پہ بوسہ دے گی تو شاید وہ بھی اسی طرح پیار سے مغلوب ہو کر خوشی سے تالیاں بجائے گا جیسے اس روز سہانہ واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی ہال میں بجا رہی تھی۔ دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر کسی دن شاہ رخ خان کو لالہ کے اس پھول کے بارے میں پتہ چل گیا تو اسے کیسا لگے گا؟ کیا سوچے گا وہ اس بے انت کہانی کے بارے میں؟۔

●●

اقبال مہدی
Abid Villa
267-A Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Email : mehdieryobank@yahoo.in
Tel : 011-26834569
Mob : 09868115302

''انگلیاں فگار اپنی........''

جاوُ و چھوٹا تھا اور اپنے گھر کے باغ میں پودوں کی پتیاں نوچتا پھرتا تھا۔ مالی بابا نے اسے سمجھایا کہ بیٹے پودوں کی پتیاں نہیں نوچتے۔

''کیوں بابا؟'' اس نے پوچھا

''بھیا! یہ پتیاں جو ہیں ناں یہ تو پودوں کی انگلیاں ہیں جن سے یہ پودے دھوپ کے دامن سے اپنے لئے کھانا تیار کرتے ہیں، اپنے لئے رنگ چنتے ہیں!'' رنگ جو جا بن کے ہتھیلیوں میں آفتاب اور آنکھوں میں ستارے چکا تا ہے۔

آپریشن تھیٹر میں سوا نیزے پہ کئی سورج چمک رہے تھے اور میز پر زخمی شخص گھڑی کے کل پرزوں کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ پٹیوں سے اس کا چہرہ تقریباً ڈھکا ہوا تھا۔ سرجن اس پر جھکے ہوئے تھے۔ نرسیں ایک ایک کر کے آلات جراحی سرجنوں کو تھما رہی تھیں۔ مریض بہت زخمی ہوا تھا۔ وہ دہلی ہائی کورٹ میں گواہی دینے گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی موت اُسے کھینچے لے جا رہی تھی۔ انسانیت کے لئے وہ ہائی کورٹ گیا تھا مگر حیوانیت کا شکار ہو گیا۔ اس کے بازو اور ناک میں نلکیاں لگی تھی اور خون اور اکسیجن دیا جا رہا تھا۔

جادو آگے بڑھا، پروفیسر نے سفید ماسک کے اوپر چمکتی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے دیکھا اور اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر زخمی کی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی کلائی میں ٹانکے لگا رہا تھا، جس کے سر پر ہاتھ کا پھول کھلتا ہے لیکن اب وہاں صرف آدھی خون آلود ہتھیلی نظر آ رہی تھی۔ اس نے پروفیسر سے پوچھا_____

''لگتا ہے کوئی پیچیدہ کیس ہے سر؟''

''ہاں! اس شخص کے سر اور پسلیوں میں شدید چوٹیں آئی ہیں اور دایاں ہاتھ کچھ اس طرح زخمی ہوا کہ ساری انگلیاں ضائع ہو گئیں۔'' پروفیسر دوبارہ میز پر جھک گیا اور زخموں کو کمال مہارت سے سینے لگا۔

''اُف!'' اس نے بے چینی سے ایک نظر زخمی کی کلائی کو دیکھا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ شاید یہ شخص ٹھیک ہو جائے مگر انگلیاں جو ہاتھ کی پہچان ہوتی ہیں۔ ان سے تو ہاتھ کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ انگلیاں جن کی سب کو ضرورت ہوتی ہے؟ پروفیسر نے ترس سے کہا۔

''آکسیجن لگاؤ!'' میز پر لیٹے ہوئے شخص کی کچلی ہوئی انگلیاں ایک بار پھر ڈاکٹر جاوید کی آنکھوں میں ابھر آئیں۔ اچانک انہیں اپنی انگلیوں میں کلبلاہٹ محسوس ہوئی۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ ہاتھ دستانے میں چھپا ہوا تھا۔ ہاتھ کی لکیریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ عمر کی لکیر، عقل کی لکیر، قسمت کی لکیر، ستارے، جزیرے، اُبھار، نصیب، ترقی و جد و جہد، کامیابی___ پورا زندگی کا ایک ورق!

اس نے سوچا، ہاتھ زندگی کا مطلق العنان حاکم، جس کے سر پر انگلیوں کا سنہرا تاج جھلملاتا ہے۔ عجیب سے تصور سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اس نے کئی گداز انگلیوں کو اپنے بالوں میں تیرتے محسوس کیا۔ وہ نرم و نازک ریشمی انگلیاں، اس نے انہیں گنگناتے سنا اور بولا

''زوبی! تمہاری انگلیوں میں جادو ہے۔ ان میں جگانے اور سلانے کی طاقت ہے۔ جب تم میرے بالوں کو چھوتی ہو تو میری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور جب تم انہی انگلیوں سے ستار چھیڑتی ہو تو یوں لگتا ہے کہ ایک نئی دنیا بیدار ہو رہی ہے۔ آواز کی چنگاریوں میں غسل کر کے یہ وحشی، اداس کائنات جیسے انگڑائی لے کے جاگ اٹھتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مغل طرز مصوری میں، چغتائی کے آرٹ میں، انگلیوں کی مخروطی ساخت، جس کے سبب ہاتھ کنول کے ادھ کھلے پھولوں کا عکس معلوم ہوتے ہیں، بالکل وہی ہے جو تمہاری انگلیوں کی ہے...........''

زوبی نے قہقہہ مارا اور پھر سنجیدگی سے بولی_____

''ہو سکتا ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ تم ایسی ہی باتیں کرتے رہو گے اور میں سنتی رہوں گی_____ تم خطرناک حد تک تخیل پرست، شاعر، فلسفی اور نہ جانے کیا بلا ہو!''

''نہیں! میں سچ کہہ رہا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ میرا مقصد تمہاری جھوٹی تعریف نہیں بلکہ تمہاری صلاحیت کا سچا اعتراف ہے۔ زوبی! تمہاری انگلیوں کے کنول جھلملاتے ہیں، تمہاری انگلیاں باتیں کرتی ہیں........''

''جھوٹ!'' زوبی نے مسکراتے ہوئے کہا........''کہیں انگلیاں بولتی ہیں؟''

''زوبی! جانتی ہو پورا ہندوستانی کلاسیکی رقص، سازوں، باجوں کی لہریں، آوازیں انگلیوں پر ہی تو بنیاد ہیں۔ یہ اشارے کرتی ہیں، سوچتی ہیں''۔ زوبی نے قہقہہ لگایا اور چلی گئی۔

جاوید بازار سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر چاک سے تصویریں بناتا تھا۔ طویل سُرمئی سلیٹ پر رقص کرتے، سفید چمکیلے نقوش جو ہاتھ اٹھا کر گزرنے والوں کو آواز دیتے تھے۔ کسی دن وہاں ان کی ملاقات قدیم رومنوں کے آہن پوش گلے ڈیٹرز (Gladiators) سے ہوتی جو رزمگاہ سے غلاموں کے سرنگوں جسموں سے اپنی خون آشام تلواروں کی پیاس بجھاتے نظر آتے۔ کبھی زمین پر سفید رنگ کے دیو پیکر گدھوں کی قطاریں چونچیں کھول کر راہ گیروں کے تعاقب میں لپکتیں اور کبھی یہاں سے وہاں تک گلاب کھلے ہوتے، جن پر اجلے پروں والی تتلیاں دائروں میں چکر کاٹتیں۔ اس شخص کے پوروں سے تو چہروں اور تصویروں کا دریا بہہ نکلتا تھا۔ اس کے گرد نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا۔ وہ لوگوں کے اعضائے بدن پر نت نئی تصویریں بنانے میں کمال رکھتا تھا، سورج، بادبان، کشتیاں، کیوپڈ، گلاب........

ٹیٹو (Tato) کے شائق اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر باریک سوئیوں سے اپنی پسند کی تصویریں گھدواتے اور مسکراتے ہوئے اپنی راہ لیتے۔ وہ تو مسکراہٹیں بیچتا تھا۔ خود اس کی کلائی پر بے حد خوبصورت شہنائی گُھدی تھی۔ ایک دن کسی نے پوچھا ____

''آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟''

''فائدہ!'' وہ ایک آدمی کے ہاتھ پہ تتلی کاڑھتا ہوا بولا ____

''جناب!'' آپ جانتے ہیں کہ اس پُرشعور تعفن زدہ دنیا میں لوگ خوشیوں کے قحط سے مر رہے ہیں اور میں انہیں تھوڑا سا خوش دیکھنے کی آرزو میں اپنی انگلیاں چلا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید لوگوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں واپس آسکیں، بس یہی فائدہ ہے۔''

پروفیسر نے کہا ''دل کی دھڑکنیں معمول کے مطابق نہیں، خون کی نلکیاں ٹھیک کرو۔'' پروفیسر کی نظریں پھر آپریشن ٹیبل پر مرکوز ہوگئیں۔ پروفیسر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور اس کی تیز رفتار انگلیاں زخمی شخص کی زندگی کی ڈور کو سلجھا رہی تھیں۔

ایک بار پھر زوبی نے جادو کے کان میں سرگوشی کی ____ ''میں بھی شاید ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی انگلیوں سے زندہ رہتے ہیں۔''

''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تمہاری انگلیوں کا کنول سدا بہار ہے۔'' جادو نے کہا۔

زوبی کا نقرئی قہقہہ فضا میں بکھر گیا ____

''اچھا تو یہ سنو، تم ضرور خوش ہوگے کہ اب یہ کنول کمپیوٹر پر کھلے گا، میں نے ستار بجانا چھوڑ دیا ہے اور ملازمت ڈھونڈ لی ہے۔''

''کیا! کیا کہا؟'' وہ ایک دم گھبرا کے بولا۔

''مجھے پتہ تھا ....'' زوبی نے کہا ....'' تم اسے پسند نہیں کرو گے لیکن ہمارے حالات؟''

''مگر تم نے ایک بار مجھ سے پوچھا تو ہوتا؟''

''کیا پوچھتی؟ یہ پوچھتی کہ میں صرف تمہارے سامنے بیٹھی ستار بجاتی رہوں اور بجاتے بجاتے اپنی انگلیاں لہولہان کرلوں اور تم بیٹھے مسکراتے رہو۔ خوش ہوتے رہو۔ تم مجھے سروں کے زنداں میں قید کر کے اپنی انا کو تسکین دیتے رہو......''

''زوبی! دیکھو جذباتی نہ بنو۔ بس ایک سال کی ہی تو بات ہے اور پھر.........!''

''مجھے پتہ ہے جادو ۔۔۔'' زوبی نے کہا ____ ''پھر تم ڈاکٹر بن جاؤ گے اور تمہارے گھر سے ایک روایتی آواز اٹھے گی جو ہمارے خلاف ہوگی۔''

''ایسا نہیں ہوگا تم وقت آنے پر دیکھ لینا!''

جادو عاجزی سے بولا۔

اور پھر...... جب وقت آیا تو جاوید کے گھر میں بھڑوں کا چھتہ ٹوٹ گیا اور مکڑی کے جالوں سے گرجدار آواز ابھری ____ ''اس سے کہو کہ وہ فضول سی نوکری ترک کردے۔ گھرداری کرے۔''

''زوبی! تمہاری انگلیاں کمپیوٹر کے لئے نہیں بنیں۔ تم ذرا ان کی آواز سنو ان سے تو موسیقی کے شگوفے چٹکتے ہیں۔ تم نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔'' وہ بولا ''واہ کیا خوب! جو لوگ انگلیوں کو کمپیوٹر پر نہیں دیکھ سکتے، وہ ستار کے تاروں پہ تھرکتے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟'' زوبی نے سرد آہ بھری ''بدن کے دیس میں انگلیاں عوام الناس کی طرح جیتی ہیں۔ اگر دیس کو زندہ رکھنا ہے تو حالات کے مطابق انہیں بھی مصروف رہنا ہوگا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں جینے کے احساس سے عاری ہوجاؤں اور ایک دن تم آؤ اور میرے ہاتھوں میں میخیں ٹھونک کر مجھے صلیب پر لٹکا دو۔ میری انگلیوں اور ہتھیلیوں سے جب خون کی بوندیں ٹپ ٹپ گریں تو تم جلترنگ کی آواز سنو، ستار سے نکلی دھن سنو ____ الغوزوں کی مضطرب آواز تمہیں مسرت اور طمانیت کا احساس دلائے لیکن ہونے والی بیوی نوکری کر کے شوہر کے مدِ مقابل نہ کھڑی ہوسکے۔ سنو! میری بھی خواہشیں ہیں......''

''زوبی! جذباتی نہ بنو۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا پسند ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے لیکن......''

''تمہاری ہر بات کیوں اور نہیں پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن تمہیں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ میری انگلیاں کیا چاہتی ہیں۔ یہ ہر دم متحرک رہنا چاہتی ہیں، کسی تعمیر، کسی ترتیب میں مصروف ____ یہ مزدور ہیں جو بوجھ اٹھانا چاہتی ہیں۔ مجھے ان کی پکار چند سال پہلے سنائی دی تھی جب میں تاج محل دیکھنے گئی تھی۔ اس حسین یادگار کے گوشے گوشے سے انگلیاں جھانک رہی تھیں اور میرے نزدیک سچ پوچھو تو اس کی خوبصورتی ماند پڑ گئی تھی جب ان معماروں ____ ان جادوگروں کا خیال آیا کہ جن کی انگلیاں شہنشاہ نے کٹوا دی تھیں ......میں بھی ایک عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہوں ____ یہ میری خواہش ہے ____ میرا خواب ہے! میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں میرے دوست لیکن اگر میری مکمل شخصیت تمہارے لئے قابل قبول نہیں تو......''

یکا یک پروفیسر کے ہاتھ سے قینچی چھوٹ گئی اور اس کے میز پر گرنے سے قدرے زور کی جھنکار ہوئی۔ پروفیسر نے کہا ____ ''انگلیاں جڑنے کی امید نہیں' شاید کہنی سے ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔'' زخمی کا پٹیوں سے لپٹا ہوا سراپا کفن پوش لگ رہا تھا۔ پروفیسر تشویش سے بولا ____ ''خون بہت بہہ چکا تھا لیکن آپریشن ضروری تھا۔ اسی وقت زخمی نے بے ہوشی کے عالم میں ہچکی لی اور اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زخمی سر ایک طرف جھک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس شخص کی عریاں کلائی پر شہنائی کی تصویر گدی تھی۔

اسی لمحے جادو نے ایک بے نام سی آگہی کو اپنے سینے میں اترتے محسوس کیا۔ معاً زوبی کی آواز سنائی دی ____ ''بے چاری حساس انگلیاں........ سنو! مجھے ایسی زندگی قبول نہیں جس میں انگلیوں کی خوشیاں شامل نہ ہوں!''

زوبی چلی گئی ____ جادو کو لگا کہ اس نے تو اسے پہچانا ہی نہیں۔ یہ کیا ہوا؟ خدا جانے کیا ہوا ____ وہ تو بس اس قدر جانتا تھا کہ فیصلے کے چند لمحے نہ تھے، چند صدیاں تھیں۔ جو چند لمحوں میں گذر گئیں......!!

○○

سیاہ تاج!

شکیل افروز
afroseshakil@yahoo.in
12/H/H/3, Patwar Bagan Lane
Kolkata - 700009

سوزان لندن سے آگرہ آئی تھی اور اپنے ساتھ اپنی تہذیب بھی لائی تھی۔ لباس بالکل ڈھیلا ڈھالا، ہوا چلتی تو خدوخال نمایاں ہوجاتے۔ اوپر پتلی سی قمیص تھی۔ بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مہتابی حسن کے دل اور تل دونوں دکھ رہے تھے۔

وہ کنواری تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ ابھی تک اپنی عصمت بچائے ہوئے تھی۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن سے بے حد متاثر تھی۔ شادی کی متمنی ضرور تھی لیکن کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پیشے سے وہ آرکیٹکٹ تھی۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کو ڈھونڈنے کے لئے دنیا کے چکر لگا رہی تھی۔ تاریخی ورثے دیکھنے کے بہانے اس نے نہ جانے کتنے لڑکوں کو قریب سے دیکھا۔ کوئی اس کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شریک زندگی کی چاہت میں سرگرداں تھی جو اسے ٹوٹ کر پیار کرے اور ہندوستانی تہذیب کی طرح زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔

تاج کے احاطے میں کئی گائیڈ تھے۔ ان میں تیئس سالہ شیٹی سب سے منفرد تھا۔ خوبرو اور دل پھینک۔ جوں ہی اس کی نظر سوزان پر پڑی وہ اپنے ہونٹوں کو داب کر رہ گیا!۔

اس پورے علاقے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دنیا کی مختلف زبانوں کا ماہر، ماہر ہی نہیں بلکہ اہلِ زبان کی طرح اس میں روانی تھی۔ دیسی لوگوں سے تو کچھ رعایت برت لیتا لیکن گوروں سے دس ڈالر سے کم نہیں لیتا تھا۔ سوزان کو وہ بہت اچھا لگا اور وہ اس کے ساتھ ہولی۔

''دیکھئے، یہ تاج ہے اور یہ تاج کا باغ۔ کہتے ہیں اس قسم کا باغ جنت میں ہے۔''

''اور تاج کہاں ہے؟''

''یہ تو لاجواب ہے میڈم! اندر سے یہ چونے گارے سے بنا ہوا ہے۔ اوپر سے سنگ مرمر سے مزین ہے۔ یہ دیکھئے، مقدس آیات ہیں، وہ دیکھئے خوش نویس کا نام امانت خان لکھا ہے۔ ایک جیسا دکھنے کے لئے اوپر کے حروف بڑے بڑے لکھے گئے ہیں۔''

''جانتی ہوں۔'' سوزان نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ شہنشاہ نے دریا کے کنارے ہی تاج بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میڈم--کسی کسی عمارت کے لوکیشن میں ویرانہ پن بہت اہم ہوتا ہے۔ اصل میں یہ عام عمارت نہیں بلکہ یہ عمارت مقبرہ ہے۔ ویرانی اس کا تجسیم ہے۔ موجوں کے تھپیڑے ویرانی میں ہولنا کی پیدا کرتے ہیں۔ دیگر فطرت کی بات کریں تو بادل کی آوارگی، چاند کی چاندنی اور ندی کے بدن کو چومتی ہوا ،بھی ویرانیوں سے ملتفت ہیں۔

''اوہو! تم تو شاعر بھی ہو''

''نہیں میڈم! میں تو آپ کا میزبان ہوں''

''یہ دیکھئے میڈم! تاج کے گنبد کو دیکھئے، کتنا خوشنما ہے لیکن بیچارہ بہت فکر مند ہے۔ کہتے ہیں اس میں ایک سوراخ ہے جس سے بارش کی ایک آدھ بوند نیچے اصل مقبروں تک چلی جاتی ہے۔ لوگوں کا ماننا ہے کہ جب تاج پر خوب بارش ہوتی ہے تو یہ روتا ہے، کیوں میڈم؟''

''میں نہیں جانتی'' سوزان تاج کو دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھی۔

''وہ دیکھئے! میڈم، اس کے چاروں سمت چار مینار دیکھ لیجئے۔ یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ کبھی جو یہ بکھرے تو اصلی عمارت پر نہیں گریں گے، کیا خوب کاریگری ہے!''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے''

''یہ دیکھئے در و دیوار پورے قیمتی سنگ مرمر کے ہیں۔ کئی رنگین پتھر اب بھی لگے ہوئے ہیں۔

''لیکن یہ کیا ہیں؟''۔ سوزان نے ان پتھروں پر ہاتھ پھیرا تو سیاہ دھول چپک گئی۔ دیکھو یہ تو زردی مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تو سرطان کی گرفت میں آگئے ہیں۔ سو دوسو سال بعد یہ خوبصورت عمارت بکھر جائے گی اور یہ سب آلودگی کے باعث ہورہا ہے۔''

''نہیں میڈم۔ بات دراصل یہ ہے کہ شہنشاہ کو سفید تاج کے ساتھ سیاہ تاج بھی بنانے کا بہت شوق تھا۔ وہ دیکھئے! سیاہ سنگ مرمر اب بھی وہاں بکھرے ہیں۔ اس وقت حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اب تو حالات موافق ہیں۔ شاید فطرت کو یہی منظور ہے۔ آلودگی کی وجہ سے اب اس پر سیاہ پرت جمتی جارہی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟---شہنشاہ کا خواب پورا ہورہا ہے۔''

اس بات پر سوزان کو غصہ آگیا اور اس نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔ پورے تاج میں اس کی بازگشت سنائی دی۔ شیٹی گال پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے رخسار پر سیاہ تاج جگمگا رہا تھا۔

سوزان نے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور اس کے منہ پر پھینک دیا۔ پھر وہ تاج کے سامنے آگئی۔ عین صدر کے سامنے، اور خود کو بے لباس کرکے سیاہ گرد اپنے گورے بدن پر ملنے لگی۔ سیاحوں نے اس ماجرے کو دیکھ کر اسے جنونی قرار دیا۔ دور کھڑے سپاہیوں تک جب یہ بات پہنچی تو اسے عریانیت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔

لیکن یہ تو سوزان ہی جانتی تھی کہ اس کا میسج ڈی کوڈ ہوا ہے یا نہیں!!!

●●

احوال و اخبار

کونسل اب تخلیقی ادب بشمول ناول، ڈرامہ اور شعری مجموعوں پر مالی تعاون فراہم کرے گی۔وسیم بریلوی
کونسل سال رواں میں 122 مصنفین کو 73 لاکھ کی مالی امداد فراہم کرے گی۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

قومی اردو کونسل نے نئی مالی تعاون کمیٹی کو اس طرح وسعت دی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نئے تصورات سامنے آئیں، جس سے پالیسی کا نفاذ بہتر طریقے سے ہو اور اردو کے فروغ میں ہندوستان کی ہر ایک ریاست کی نمائندگی ہو۔کونسل اپنی سب سے اہم مالی تعاون اسکیم کے ذریعے اردو کو ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی ریاست کو فروغ اردو کے عمل میں اہمیت دینا چاہتا ہے۔ان الفاظ کے ساتھ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے رواں مالی سال 11-2010 کی دوسری بڑی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ کا آغاز کیا۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی سطح پر ہر ایک ریاست اہم ہے اس لیے کمیٹی کی جانب سے کئی اہم تجاویز بھی سامنے آئیں۔جس کے تحت یہ فیصلہ لیا گیا کہ اردو کونسل کے تعاون سے ہونے والی ریاستی سطح کی سرگرمیوں میں کونسل کا نمائندہ موجود رہے گا۔

آج کی یہ میٹنگ کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ کونسل اب تخلیقی ادب بشمول ناول، ڈرامہ، سوانح ادب اور شعری مجموعوں کو مالی تعاون فراہم کرے گی۔

کونسل کی نئی تشکیل شدہ گرانٹ ان ایڈ کمیٹی نے اس رواں مالی سال 11-2010 میں گرانٹ ان ایڈ اسکیم کے تحت ریاستوں میں ہونے والے اردو سمینار، کانفرنسوں اور ورکشاپ، سالانہ یادگاری لیکچر سیریز اور اردو عربی اور فارسی کے مسودات کی اشاعت کیلئے -/70,00000 کی مالی رقم منظور کی گئی ہے۔

کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کے ممبر جناب علیم الدین اسعدی نے کہا کہ جن اداروں کو گرانٹ دی جارہی ہے ان کی کارکردگی اور شفافیت کو پر نظر رکھنی چاہیے۔سماجی کارکن اور کونسل کے ممبر جناب فرید احمد نے کہا کہ کونسل اپنی اس مالی تعاون کی اسکیم کے تحت ہر ایک تخلیق کار کو اہمیت دیتی ہے۔ جناب پرواز علوم نے کونسل کے ڈائرکٹر کے سامنے کئی اہم تجاویز رکھیں، جس کے تحت جو سرکاری افسران اردو کے فروغ میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں کونسل کی جانب سے ان کی ستائش کی جانی چاہیے۔

رابطہ عامہ سیل

کلام غالب کی تفہیم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا : گوپی چند نارنگ

نئی دہلی ۔۲۲ نومبر۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے آج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ''غالب کی باز دید'' کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ غالب کے کلام میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے جس کی تلاش آسان نہیں ہے۔ان کے کلام کی بڑی تعداد میں شرحیں لکھی گئی ہیں اور ہر شرح ایک دوسرے سے مختلف ہے اور شرح نویسی کا سلسلہ جاری ہے، جو آگے بھی جاری رہے گا۔غالب ہندوستان کے بڑے شاعر تو ہیں ہی وہ عالمی سطح کے بھی شاعر ہیں۔ وہ مشکل گو اور پیچیدہ پسند شاعر ہیں لیکن سب سے زیادہ انہی کے اشعار پسند کیے جاتے ہیں، سب سے زیادہ تفہیم انہی کے کلام کی ہورہی ہے، سب سے زیادہ انہی کے اشعار کی مثالیں دی جاتی ہیں اور سب سے زیادہ انہی کے اشعار لوگوں کو یاد ہیں۔

پروفیسر نارنگ نے اپنے انتہائی بلیغ اور معلومات افزا خطبہ میں کہا کہ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا اور ان کا فارسی کلام اردو کا کئی گنا ہے لیکن ان کو شہرت اردو شاعری سے ملی۔ ان کے اردو کے اشعار بہت کم ہیں اور ان کا بہت سا کلام، کلام منسوخ کے طور پر جانا جاتا ہے۔انہوں نے انیس سال کی عمر تک جو اشعار کہے ہیں وہ بھی بے حد پیچیدہ ہیں اور ان میں بھی بہت معنویت ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے غالب کے کئی اشعار سنائے۔ پروفیسر نارنگ نے زور دے کر کہا کہ غالب کے کلام میں Paradox بہت ہیں۔انہوں نے کہا کہ پیراڈاکس کو اردو میں قول محال اور قول متناقص کہا جاتا ہے۔لیکن اس انگریزی لفظ کا اردو میں ایسا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا جو اس کا ہم معنی ہو۔ بہرحال غالب کے کلام میں اقوال محال یا اقوال متناقص کی بھرمار ہے۔اسے مہمل گوئی بھی کہا جاتا ہے اور غالب کے بہت سے اشعار کو ان کی زندگی میں مہمل کہہ کر خارج کر دیا گیا تھا۔خود انہوں نے بھی اپنے بہت سے اشعار کو مسترد کر دیا ہے لیکن وہی اشعار آج لوگوں کو بہت زیادہ پسند آرہے ہیں اور ان میں بہت زیادہ فکر و فلسفے کی باتیں ہیں۔گوپی چند نارنگ نے کہا کہ غالب نے بارہ سال کی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور ابتدا سے ہی وہ مشکل گو رہے ہیں۔ انیس سال کی عمر تک ان کا تخلص اسد تھا جسے بعد میں انہوں نے غالب کر دیا۔انہوں نے کہا کہ اس وقت دنیا کے جو بڑے شعرا ہیں اور جن کی عالمی حیثیت ہے ان کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن غالب کے اشعار کی تعداد محض اٹھارہ سو ہے اور ان کا دیوان آپ جیب میں رکھ سکتے ہیں اس کے باوجود وہ ایک عالمی شاعر ہیں۔ جبکہ شیکسپئر اور دیگر بڑے عالمی شعرا کا کلام کئی کئی جلدوں میں چھپا ہے۔کلام غالب کا ترجمہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ہورہا ہے اور ہندی میں ان کے کلام کی متعدد شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ غالب کی زندگی میں بھی پیراڈاکس کی بہتات ہے۔اس حوالے سے انہوں نے کئی واقعات کو مثال کے طور پر پیش کیا۔ گوپی چند نارنگ نے مرزا غالب کی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر بھی سحر طراز انداز میں روشنی۔ غالب نے جہاں بے شمار مشکل اشعار کہے ہیں وہیں انہوں نے آسان اور عام فہم زبان میں بھی بے شمار اشعار کہے ہیں اور ان میں بھی اقوال محال یا اقوال متناقص موجود ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ نے بھی غالب کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا۔

رابطہ: سہیل انجم، دہلی

امریکہ۔ کنیڈا اور برطانیہ کے کامیاب ادبی دورے کے بعد ڈاکٹر کیول دھیر کی بھارت واپسی کنیڈا کے قومی دن پر ہاؤس آف کامنز (پارلیمنٹ) کی طرف سے سرکاری اعزاز۔

معروف ادیب اور ساحر کلچرل اکیڈمی کے چیئرمین ڈاکٹر کیول دھیر امریکہ۔ کنیڈا اور برطانیہ کے علمی، ادبی، ثقافتی اور سرکاری اداروں کی خصوصی دعوت پر کامیاب ادبی دورے کے بعد بھارت واپس آ گئے ہیں۔

امریکہ میں اس دورے کا اہتمام اردو ٹائمز کی طرف سے عالمی اردو کانفرنس اور ایشین لٹریری فاؤنڈیشن نے کیا جس کے تحت ڈاکٹر کیول دھیر نے عالمی کانفرنس کے فیض سیمینار کی صدارت کی اور ایشین لٹریری فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام نیویارک، لاس اینجلس اور ٹورانٹو (کنیڈا) میں ساحر میموریل لیکچر سیریز میں خطاب کیا۔

کنیڈا کے قومی دن کنیڈا ڈے کے موقع پر فیض احمد فیض کے صد سالہ جشن کے حوالے سے ہاؤس آف کامنز (پارلیمنٹ) کی طرف سے کنیڈا میں مقیم ڈاکٹر تقی عابدی کے علاوہ بھارت سے ساہتیہ اکاڈمی کے سابقہ صدر و محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر کیول دھیر کو سرکار کی طرف سے ایک پُر وقار تقریب میں قومی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقع پر اونٹیریو کی صوبائی اسمبلی کی طرف سے بھی ان کی عزت افزائی کی گئی۔

اردو سوسائٹی آف کنیڈا۔ کین پاک چیمبر آف کامرس۔ اردو انٹرنیشنل۔ سخنور اور ساؤتھ ایشین رائیٹرز گلڈ کی طرف سے ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں خصوصی تقریبات منعقد کی گئیں۔ علاوہ ازیں اردو ٹی وی، اے۔ ٹی۔ این۔ ٹی۔ وی، راول ٹی وی اور ٹیلیویژن پنجاب کے علاوہ علاقائی زبان کے مقامی ریڈیو کی طرف سے خصوصی انٹرویو نشر کئے گئے۔ ان کے علاوہ اردو، ہندی اور پنجابی کی مختلف علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی طرف سے ٹورانٹو، مسی ساگا، بریمپٹن، مانٹریئل اور اوٹوا میں ڈاکٹر دھیر کے اعزاز میں ادبی اجتماع منعقد ہوئے۔ ادارہ کین پاک کی طرف سے ڈاکٹر کیول دھیر کے زیر ادارت جریدہ ''ادیب'' کا اجراء ٹورانٹو کے پانچ ستارہ ہوٹل ہولی ڈے ان میں ہوا جس میں ڈاکٹر نارنگ، بیدار بخت، اطہر رضوی، شکیلہ رفیق، کرنل انور، شاہین ولی عالم، اکرام بریلوی، ڈاکٹر تقی عابدی، پروین شیر، فرحت پروین کے علاوہ سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ کنیڈا میں مقیم نامور ادیب وقلم کار اشفاق حسین، حلیم الٰہی زلفی، شاہد ہاشمی، نسیم سعید، ذکیہ غزل، سلطان ظفر، روبینہ فیصل، مبارکہ شگو اور احمد پاشانی نے ڈاکٹر دھیر کے ساتھ مختلف مواقع پر ادبی شام منائی۔

قیام برطانیہ کے دوران لندن میں بھارتی ہائی کمشنر کے زیر اہتمام لندن میں ادارہ ادب کے تعاون سے ''ادیب'' کے اجراء کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر دھیر کے ساتھ ایک خوبصورت شام منائی گئی۔ سوہن راہی، رضا علی عابدی، ساحر شیوی، اقبال مرزا، عبدالغفار عزم، نیلم، دویا ماتھر، اندر سیال، چمن لال چمن، جتیندر بلو، روی شرما، برطانیہ میں ممبر پارلیمنٹ ویریندر شرما نے بھی ادبی محفلوں کا انعقاد کیا۔ ساحر اور فیض کے حوالے سے ڈاکٹر کیول دھیر نے مختلف تقاریب میں شرکت کی اور اس صدی کے دو بڑے شاعروں کو خراج تحسین پیش کیا۔

انیس رفیع کے افسانے زندگی کی سچائیوں سے عبارت ھیں

(ممتاز عارفی، لٹریری سکریٹری، مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا) مشہور شاعر و ادیب پروفیسر قیصر شمیم صاحب کی صدارت میں ۲ راکتوبر کو مسلم انسٹی ٹیوٹ لٹریری کمیٹی کے زیر اہتمام ''ایک شام انیس رفیع کے ساتھ'' منائی گئی۔

لٹریری کمیٹی کے چیرمین اور شاعر و صحافی جناب انجم عظیم آبادی نے اپنے تمہیدی کلمات میں کہا کہ جناب انیس رفیع بحیثیت افسانہ نگار عالمی پیمانے پر قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں منعقد اس شام کا مقصد جہاں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ہے وہیں ان کے فن پر گفتگو کرنا مراد ہے۔ انیس رفیع کے افسانوں میں جدید علامتیں ہوں یا سادہ بیانی کے جوہر، بلاشبہ ان کے افسانے زندگی کی سچائیوں سے عبارت ہیں۔

شعبہء اردو کلکتہ گرلز کالج کی صدر پروفیسر یاسمین اختر نے اپنے مقالے میں ان کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جناب انیس رفیع منفرد مزاج افسانہ نگار ہیں۔ ان کا اسلوب ان کے ہم عصروں سے نہ صرف جدا ہے بلکہ ایک خاص کشش بھی رکھتا ہے۔ اپنے تلخ تجربات اور مشاہدات سے افسانوں میں جہاں رنگ آمیزی کرتے ہیں وہیں استحصال و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا ان کا ایک الگ رویہ ہے۔

دوردرشن کولکتا کی نیوز کاسٹر اور سریندر ناتھ کالج کی پروفیسر نصرت جہاں نے انیس رفیع کے شخصی پہلوؤں بشمول ریڈیو اور ٹی وی کے حوالے سے ان کی خدمات اور ان کے طریقہ کار کو نہایت شگفتگی سے بیان کیا نیز اپنے مضمون میں انہوں نے کہا کہ انیس رفیع کے مشاہدات دوسروں کے مرہون منت نہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر رنگ میں دیکھا ہے ان کے افسانے فطری آہنگ سے مزین ہوتے ہیں۔ ابوذر ہاشمی نے دلچسپ انداز میں تحریر کردہ خاکہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ انیس رفیع نے افسانے سے پہلے رپورتاژ بعنوان ''فراق'' لکھی، جب صبح نو میں اس کی اشاعت ہوئی تو اصحاب نظر انیس رفیع کو جاننے کے لئے تفتیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مزاحیہ مضمون بھی لکھے ہیں۔ یقیناً رپورتاژ نگاری اور مزاح نگاری ان کی اضافی ادبی خصوصیتیں ہیں۔

جناب ظہیر انور نے کہا کہ انیس رفیع کے افسانوں کی تکنیک اور ان کے اسلوب پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کی اس خوبصورت شام میں شہر کے مستحکم اور ممتاز افسانہ نگاروں اور ادب نوازوں کی شرکت یہ ظاہر کر رہی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے انیس رفیع کس قدر مقبول ہیں۔ انشاء کے مدیر جناب ف۔س۔ اعجاز نے اپنے مقالے میں ان کے فن کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ انیس رفیع نے اپنے دو مجموعوں میں کہانیوں کی وہ ورائٹی پیش کی ہے جو ان کے عہد سے انہیں آگے لے جائے گی۔ ان کے افسانے انسانی ذہن کے ساتھ انوکھا تجربہ ہیں۔ کئی افسانے علامتی ہیں اور تلاش کرنے سے ان کی تہوں میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔

سماجی شخصیت جناب نثار وارث نے کہا کہ انیس رفیع اس وقت کے مایہ ناز افسانہ نگار ہیں۔ بحیثیت انسان بلند کردار نیک خو ہیں۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں وہ ان کی سچی لگن، محنت اور تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے۔

صاحب اعزاز انیس رفیع نے اپنے تاثرات میں کہا کہ آج کی اس مجلس میں میرے بارے میں جتنی باتیں ہوئی ہیں ان میں بہت سی باتوں سے میں لاعلم تھا۔ نصرت جہاں کی باتوں سے مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی زندہ دلی کے ساتھ اسی طرح جیتا رہوں، کلکتے میں جس قدر میری پذیرائی ہوئی ہے اس سے مجھے مزید حوصلہ ملا

ہے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کا میں شکر گزار ہوں۔ صدرِ محفل جناب قیصر شمیم نے اپنے صدارتی خطبے میں پڑھی جانے والی تحریروں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کی یہ شام انیس رفیع سے موسوم ہے لیکن جتنی اہم ادبی شخصیتیں اور جس قدر اردو دوستوں کی شرکت ہوئی ہے اس اعتبار سے میری نظر میں یہ جشن سے کم نہیں۔ انیس رفیع کے بیشتر افسانے گہرے مطالعے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں استعمال ہونے والی علامتوں، اشاروں اور کنایوں کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ کلماتِ تشکر پیش کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید نے کہا کہ انیس رفیع اپنی روشن شناخت رکھتے ہیں۔

آرہا ہے "صدا" انٹرنیشنل (کشمیر) کا "بہار اردو ادب نمبر"

اردو کلچرل سوسائٹی انٹرنیشنل (کشمیر) کے زیرِ اہتمام سہ ماہی "صدا انٹرنیشنل" (کشمیر) نے "بہار اردو ادب نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا بہار کے ادبا و شعراء و فکشن نگار سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مختصر ذاتی و ادبی کوائف، پاسپورٹ سائز تصویر اور اپنی شعری یا نثری تخلیق (دو عدد) مندرجہ ذیل پتہ پر ۳۰ر دسمبر ۲۰۱۱ء تک بھجوادیں، تاکہ "صدا انٹرنیشنل" (کشمیر) ماہ دسمبر ۲۰۱۱ء تک "بہار اردو ادب نمبر" پیش کرسکے۔ مزید معلومات کے لئے رابطہ کریں:

[۱] سیدہ نسرین نقاش "صدا انٹرنیشنل" پوسٹ بکس نمبر ۸۴۹، جی پی او، سری نگر (کشمیر)
موبائل نمبر: 09596045887

[۲] نثار احمد صدیقی، جنتا میڈیکل اسٹور، کریم گنج، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار)
موبائل نمبر: 09835205497

معصوم شرقی کو اعزاز

(کلکتہ) مشہور علمی و ادبی ادارہ ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے ۴۵ ویں یومِ تاسیس کی تقریب صدارت معروف شاعر ایم علی (ہوڑہ) نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشتاق انجم نے ادا کئے۔ ادارہ ہٰذا کے مؤسس بزرگ شاعر قیصر شمیم نے اپنے افتتاحی کلمات میں ادارہ کے ۴۵ سالہ ادبی سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقع پر معروف شاعر ڈاکٹر معصوم شرقی (مصنف: عکس تاب) کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں شال، میمنٹو اور سپاس نامہ کی شکل میں اعزاز پیش کیا گیا۔ مشتاق انجم نے معصوم شرقی کی شعری ونثری خدمات کا جائزہ لیا اور اشک امرتسری پران کے زیرِ طبع تحقیقی مقالے کا پیشگی استقبال کیا۔ سکریٹری نصر اللہ نصر نے رسمِ شکریہ انجام دی۔

نصر اللہ نصر، سکریٹری ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن، ہوڑہ

عبدالاحد سازؔ کے اعزاز میں مشاعرہ

(ممبئی) ڈاکٹر عائشہ بنات والا ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ایک شاندار جلسہ استقبالیہ اور مشاعرہ اردو دُنیا کے معروف و عالمی شہرت یافتہ شاعر عبدالاحد ساز کے اعزاز میں ۱۶ر اکتوبر ۲۰۱۱ء کو پاٹکر ہال ممبئی میں منعقد کیا گیا۔ استقبالیہ کی صدارت عالی جناب ای۔ احمد (وزیرِ خارجہ و وزیرِ برائے ترقی و انسانی وسائل، حکومتِ ہند) نے اور مشاعرے کی صدارت جناب افتخار امام صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر) نے فرمائی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر قاسم امام نے انجام دیئے۔ ممبئی کے نمائندہ ہم عصر شعراء: حسن کمال، ممتاز راشد، ارتضیٰ نشاط، احمد وصی، شمیم طارق، ضمیر کاظمی، ساگر ترپاٹھی، ابراہیم اشک، شمیم عباس، ندیم صدیقی، شاہد لطیف، حامد اقبال صدیقی، راجیش ریڈی، عرفان جعفری، قمر صدیقی، عبید اعظمی، سعید راہی صاحبان اور شاعرات: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، دیپتی مشرا اور ریکھا روشنی کی شرکت نے اس مشاعرے کو نہایت خوش معیار وکامیاب بنادیا۔

عبدالاحد سازؔ پر ایم۔ فل

ممبئی یونیورسٹی کی طالبہ مس شبانہ علی شیخ نے "عبدالاحد ساز: حیات اور ادبی خدمات" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ممبئی یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر صاحب علی کی نگرانی میں تیار کیا گیا ہے۔

مرسلہ: اسمٰعیل بنات والا
مینیجنگ ٹرسٹی، ڈاکٹر عائشہ بنات والا ٹرسٹ، ممبئی

حنیف ترین کی نئی تخلیق "روئے شمیم" کا اجراء

معروف شاعر حنیف ترین کی تازہ کتاب "روئے شمیم" کی رسمِ اجراء ریاض (سعودی عربیہ) میں بزمِ ربابِ صحراء کے زیرِ اہتمام عمل میں آئی۔ جسمیں شہر ریاض کی نمایاں ادبی، ثقافتی، تجارتی و مذہبی شخصیات نے حصہ لیا۔ صدارت مشکور حسین یاد صاحب نے کی۔ شہر ریاض کی مشہور و مقبول شخصیت جناب ندیم ترین نے بحیثیت مہمانِ خصوصی تھے جناب افضل شائق، خورشید شاہ خان اور مشہور و معروف صحافی و کالم نگار جاوید اقبال مہمانان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ حفیظ الرحمٰن، کاوش عباسی، ابوظفر، محمد قیصر، بشیر مرزا، سید ضیاء الرحمٰن، جبار خاں، مرشد کمال بھی شریکِ بزم تھے۔ کے۔ این۔ واصف، پروفیسر اقبال اعجاز بیگ، میر فراست علی خسرو، صدف فریدی اور ڈاکٹر شفیق ندوی نے اس پروگرام میں اپنی تحریریں پیش کیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر محمد مختار خان
نائب صدر، بزم رباب صحرا، ریاض، سعودی عرب

شوکت عظیم کا انتقال

مغربی بنگال کے مشہور ادیب و بنگلہ۔ اردو مترجم اور صحافی شوکت عظیم کا ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ان کے آبائی شہر چاپدانی میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۲ برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور چار بیٹے ہیں۔ مرحوم کو ذیابیطس کا عارضہ لاحق تھا۔ سانس لینے میں تکلیف کی شکایت پر انھیں اسپتال منتقل کیا گیا تھا جہاں علاج کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ سیاسی طور پر مارکسی نظریے کے حامل شوکت عظیم ادیب و صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی بنگال کے ان معدودے چند مترجموں میں سے ایک تھے جنھوں نے عصری بنگلہ ادب کو بامحاورہ اردو میں منتقل کیا تھا۔

صلاح الدین پرویز نہیں رہے!

نئی دہلی: اردو کے ممتاز شاعر، صحافی، ناول نگار اور ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ ادیب صلاح الدین پرویز کا پچھلے دنوں دل کا دورہ پڑنے سے علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۹ برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ وہ طویل عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ انھیں دل کا عارضہ لاحق تھا۔ انکے آبائی محلے کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ۹ فروری ۱۹۵۲ کو الہ آباد میں پیدا ہونے والے صلاح الدین پرویز ادھر کافی عرصہ سے بنگلور میں قیام پذیر تھے۔

آپ کی ڈاک

(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

भारत सरकार
राष्ट्रीय अल्पसंख्यक शैक्षणिक संस्था आयोग
ए-बी/८१, शाहजहाँ रोड, नई दिल्ली
GOVERNMENT OF INDIA
NATIONAL COMMISSION FOR MINORITY
EDUCATIONAL INSTITUTIONS
A-B/81, Shahjahan Road, New Delhi
www.ncmei.gov.in

Tel : (R) 23385904
(O) 23367760

जस्टिस एम. एस. ए. सिद्दीकी
अध्यक्ष
JUSTICE M.S.A. SIDDIQUI
Chairman

مورخہ ۱۹/اکتوبر ۲۰۱۱ء

مکرمی!

ماہنامہ 'انشا' کے خصوصی شمارے 'سلور جبلی ٹیگور نمبر'، 'گفتنی نمبر'، 'نیاز فتحپوری نمبر' اور نظموں کا مجموعہ 'منعکس' نظر نواز ہوئے۔ ان خصوصی شماروں کے مطالعہ کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کے ادبی شعور اور زورِ قلم نے گرانقدر ادب پاروں کے ان شماروں کو ترتیب دے کر سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے محاورے کو سچ ثابت کر دیا ہے۔

ٹیگور ہمارے عہد ساز شاعر و فنکار ہی نہیں بلکہ وہ ایک مجتہد دانشور اور صاحب فکر و نظر تھے۔ گفتنی نمبر میں شامل کیے گئے، انشاء سال کے ۲۳ منتخب اداریوں کا مطالعہ غور و فکر کے نئے زاویے عطا کرتا ہے۔

کلکتہ ایک انقلابی اور ادبی شہر ہے۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ آپ اس اردو کش دور میں ایک معیاری ادبی رسالے کی آبیاری میں معروف ہیں جو پوری استقامت، آب و تاب اور بھرپور توانائی کے ساتھ اردو ادب کے قارئین کی تسکین قلب کا سامان بہم پہنچا رہا ہے۔

ان معروف نمبران کی اشاعت آپ کی دینی، ادبی اور مدیرانہ صلاحیت کی ایک روشن مثال ہے۔ ایک ماہر مترجم کی حیثیت سے آپ نے جس خوبصورتی سے متنوع نظموں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے 'منعکس' اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ آپ ایک ہشت پہلو فنکار ہیں۔ آپ کے یہ شمارے آپ کی ذہنی حرکیات کا زندہ ثبوت ہیں۔

مخلص

(سہیل اعجاز صدیقی)

○ جولائی / اگست کے انشاء میں میرا مکتوب پڑھ کر سب سے پہلا خط بریڈفورڈ سے مقصود الٰہی شیخ صاحب کا آیا۔ موصوف نے اردو کا ''اشک راگ'' تیز کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اس خط کو پڑھ کر اس بات پر ملال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ''کاش یہ خط کہیں پہلے چھپ گیا ہوتا تو میں اس کی اہم اور درد بھری و چشم کشا عبارت کو ''مخزن'' کے آخری تاریخی شمارے میں اخذ کر کے یوں کہنا چاہیے ایک طرح سے حنوط کر کے رسالے کا حاشیہ و حصہ بناتا۔ شیخ صاحب نے اپنے خط کی نقل لکھنؤ بھیجی تھی کہ کسی وجہ سے میرا خط دہرایا نہ جا سکے تو ان کا خط شاملِ اشاعت کرنے سے بات آگے نکل سکے۔۔۔

اسی درمیان میری دائیں آنکھ کا موتیا کا آپریشن ہوا اور بفضلِ تعالیٰ کامیاب رہا۔ میں اس بحث کو آگے بڑھانے سے قاصر رہا۔ ان کا دوسرا خط آیا کہ بات آگے کیوں نہیں بڑھی؟۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اردو کے رسائل (انشاء کے علاوہ) ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ شیخ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے رسائل و اخبارات بھی فروغ اردو سے زیادہ اپنے پرچے کی مصلحتوں اور ترقی پر نگاہ رکھتے ہیں جو بڑی حد تک جائز ہے۔ ان کا ظہور بھی تو اردو میں ہوتا ہے اور غنیمت ہے۔ ستم بالائے ستم گوشوں کی بھرمار نے فضا کو مزید آلودہ کر دیا ہے۔ ''اردو پڑھو پڑھاؤ پھیلاؤ'' کی کسی مہم کے لئے صفحات ہی نہیں بچتے۔ اب رسالے یا اخبارات ترقیٔ ادب کی انجمن کے جریدے تو ہیں نہیں کہ اس قسم کے اضافی بوجھ کو اٹھائیں؟ خیر اس سے ہٹ کر میں انفرادی کاوشوں میں پورا یقین رکھتا ہوں۔ اپنی اپنی جگہ آواز بلند کرتے رہنا چاہیے۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ لوگوں کی نالائقی کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو کی بات بہر صورت عوامی کانوں تک پہنچاتے رہیے۔ تمیز بھی ادب و بلاغت کے ذیل میں آتا ہے جو آپ کی رسائی میں ہے۔ دراصل آپ اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جہاں صدارت و مدارت آپ کا عین الحق ہو چکی ہے۔

''آپ سے گذارش ہے کہ جہاں آپ اپنے کالموں میں سیاست کے اپنڈکس کا آپریشن کرتے رہتے ہیں۔ اردو کی غیر اردو داں طبقہ میں مقبولیت کا چرچا اور اردو والوں کی پول کھولتے رہیے۔ بار بار رونا کہ آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے پھر آپ کے قلم کی تاثیر اور اس کا جادو، شاید کبھی تو کچھ کر دکھائے گا! کیا خبر یوں کوئی سی کتاب، کسی رسالے کا زر سالانہ بھیجنے کا رجحان پیدا ہو جائے۔

''میرا خیال ہے روزِ اوّل سے اردو پر پیغمبری وقت وارد ہے اور غریب اردو کی ''نالائق اولاد'' اس بیچارہ کو مرنے دیتے ہیں نہ جینے دیتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں یہ انتظام جس پر روپیہ پیسہ خرچ ہونے کا خطرہ ہے بس آنکھ بند کرنے سے ٹل جائے (آپ کا یہ کہنا درست لگتا ہے اردو اکاڈمیوں کے غیر ادبی تجارت پیشہ لوگ سرکاری فنڈ کی بندر بانٹ کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ سیاست کی طرح ادب میں بھی کرپشن کا دجود ہے۔) دوسری طرف جن لوگوں کے دل

میں اردو زبان وادب کا درد ہے اور جو خونِ جگر جلا کر
ادب وتخلیق کی قندیل روشن رکھے ہوئے ہیں یا اس کو
فروغ دے رہے ہیں ان کو سڑے بساندے حلقوں سے
نکل کر غیر اردو داں طبقوں میں جانا چاہئے۔ آپ نے
اپنے مکتوب میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب وہی لوگ اس
کے قدر داں ثابت ہو رہے ہیں۔''

شیخ صاحب چونکہ ایک اردو رسالے کے مدیر
رہ چکے ہیں اس لئے اردو صحافت کے درد سے واقف
ہیں اس لئے انھوں نے ''مخزن'' کے دس شمارے
نکالنے کے بعد ''بس'' کہدیا۔ یہ حال جب ''پونڈ'' کے
دیش میں ہے تو بھلا ''پائی پائی'' کے دیس میں صورتِ
حال کیا ہوگی؟ ہمارے یہاں جب بھی کوئی نیا رسالہ نکلتا
ہے تو ''ہمراہ ناچیز کی دس تخلیقات منسلک ہیں انھیں شائع
فرما کر ممنون فرمائیں اور جس شمارے میں یہ شائع ہوں
ان کی ایک کاپی تحفتاً روانہ کریں'' قسم کی تحریریں ملتی
ہیں۔ رسالہ کے سرورق پر زرِ سالانہ درج ہوتا ہے لیکن
محبانِ اردو لکھتے ہیں'' آپ کے رسالہ کا مکمل پتہ اور زرِ
سالانہ سے مطلع فرمائیں تاکہ آسانی رہے۔'' تیسرا
بہانہ ''میری مالی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی
کہ یکمشت سو روپے کی رقم روانہ کروں اس لئے
اعزازی فہرست میں میرا نام شامل کریں۔ ہمراہ میری
ایک کتاب (جس کی چھپائی مفت میں نہیں ہوئی ہوگی)
پر تبصرہ شائع فرمانے کی زحمت گوارہ کریں۔''

ان حالات میں بیچارہ ''گوشہ'' کا ستم بر
داشت نہ کرے تو کیا گوشہ گمنامی میں چلا جائے؟ اور
اب جب مغربی ممالک اور خلیجی ملکوں سے ''گوشوں''
کی سونامی آ رہی ہے تو اسے روکنے کی ہمت کس میں
ہے؟ ان میں چند حضرات تو ''صاحبِ تصنیف''
کہلوانے کے جنون میں'' لکھ بھی دو۔ چھاپ بھی دو
اور بانٹ بھی دو۔'' کے اصول پر چلتے ہوئے گوشوں
کے ذریعہ بعض پیشہ ور مدیران کا بھلا کر رہے ہیں۔
انھیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے بعض رسائل کی
صرف ''واؤچر کاپیاں'' چھپتی ہیں جو اپنا رجسٹریشن
بچانے کے لئے ضروری ہے۔ وہ ''پیشہ ور'' ''کتب
نویسوں'' کے مجموعہ ہائے اغلاط'' کو ان کے ادبی
شاہکار سمجھ کر جھانسے میں آجاتے ہیں۔ بلکہ رسم اجرا کی
زینت بڑھانے خود بھارت آجاتے ہیں۔ شکر ہے کہ
''نوحہ گر'' کو ساتھ نہیں لاتے۔ انھیں اس بات کا ذرا
بھی احساس نہیں کہ سرپرستی ان رسائل کی کرنا چاہئے جو
برسوں سے زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں اور
گھاٹے میں ہیں۔ شب خون، شبستان، شمع، بانو، کھلونا
جیسے ذہن ساز رسالے بند ہو گئے ان کی یاد میں کسی نے
دو آنسو بہائے؟ گراں فروش ہے کس درجہ کار گاہِ
جہاں/ ہزار اشک ہیں درکار اک ہنسی کے لئے

فی الوقت تو میرے ساتھ ابراہیم اشک ہیں
اور میں ان کے ساتھ اپنے ڈرامہ ''مرزا غالب کی
حویلی'' کی کامیابی کا جشن منا رہا ہوں۔ اس کے
ہدایتکار مجیب خان نے غیر اردو داں طبقوں کے تعاون
سے کامیابی کی منزلیں طے کیں۔ ایک اور خوشخبری
مہاراشٹر کی ہندی اکاڈمی نے راقم کا انتخاب ''منشی پریم
چند ایوارڈ'' (برائے کہانی) کے لئے میرا انتخاب کیا اور
مجھے ۳۵ ہزار نقد، سپاسنامہ اور میمنٹو سے نوازا۔ بقول
شاعر: جہاز خود نہیں چلتے خدا چلاتا ہے۔

قاضی مشتاق احمد۔ پونے

OOOOOO
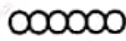
O شمارہ ستمبر، اکتوبر موصول ہوا۔ اس بار گفتنی
میں ''پرستش بے حساب'' پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے
ہندوستان اور پاکستان دو الگ ملک ہونے کے باوجود
آج تک ایک ہی جیسی سیاست اور ایک ہی جیسے
سیاست دانوں کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور وہ
عوام کو اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔ ہمارے ملک
پاکستان میں بھی ہر اُس شخصیت کے نام پر چھٹیاں
منانے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے جنھوں نے خود پوری
زندگی صرف کام کو اہمیت دی تھی خاص طور پر کراچی
میں تو آئے دن نہ صرف چھٹیاں بلکہ ہڑتالیں،
مظاہرے اور نہ جانے کن کن بہانوں سے آرام طلبی کی
عادت جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ ملک جائے بھاڑ میں۔ یہ
ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کر پاتیں
جو وقت کی قدر و قیمت کھو دیتی ہیں۔ بات کہاں سے
کہاں جا پہنچی مگر جب دل جلتا ہے تو کڑوا سچ ہی اُگلتا
ہے۔ مضامین میں حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ صاحب
کا مضمون ''روزے کا فلسفہ اور اس کے احکام و مسائل
قرآن و سنت کی روشنی میں'' نہایت قابلِ غور اور
معلوماتی مضمون رہا۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے
روزے کی اہمیت اور اسلام میں روزے رکھنے کے حکم
پر روشنی ڈالی۔ ایم۔ احمد مجتبیٰ صاحب کا مضمون ''عید
انڈمان ونکوبار میں۔ کل اور آج'' بہت خوبصورت اور
ہمارے لئے بہت ساری معلومات سے بھرپور مضمون تھا
اس سے ہمیں انڈمان اور نکوبار کے بارے میں جاننے
کا موقع ملا۔ افسانوں میں نعیم کوثر صاحب کا ''چندن
پور کا چاند'' جہاں غم زدہ کر گیا وہی آغا گل صاحب کا
''عیدی'' ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھراتا چلا گیا۔ علی محمود
صاحب کا ''صفایا'' گو کہ کوئی نئی نہیں مگر اُن کے
افسانے کا آخری جملہ ''برج موہن جیسوں کا صفایا
کرنے کوئی دوسرا دیرو پھر پیدا ہوگا'' نے افسانے میں
جان ڈال دی۔ وکیل نجیب کا افسانہ ''مرد!'' ایک
لاجواب افسانہ ہے۔ انھوں نے نہایت مختصر بیان میں
ایک ایسا بڑا پیغام دیا ہے جو سوچ کے کئی در کھول دیتا
ہے۔ ان کے علاوہ شکیل افروز، ویریندر پٹواری اور
عظمیٰ صدیقی کے افسانے بھی بہت خوبصورت اور
متاثر کن تھے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اس بار افسانوں کا
حصہ بہت جاندار رہا تو غلط نہ ہوگا۔ غزلوں میں بدر محمدی
، جلال الدین اکبر، کرشن کمار طور، اور صاحبزادہ برہان
الدین کلیم، کی نگارشات اچھی لگیں۔

رومانہ رومی، کراچی (پاکستان)

OOOOOO

O انشاء کے عید نمبر کا۔ اداریہ ''پرستش بے
حساب'' ٹیگور سے منسوب ہے۔ مغربی بنگال کی نئی
سرکار کے زیرِ اہتمام جشنِ ٹیگور کے حوالے سے آپ
نے ایک انفرادی پہلو تلاش کر لیا ہے۔ جیسے ''اس برس
ریاست میں ٹیگور کے جنم دن کی چھٹی ۲۵ بیساکھ ۹ مئی
کو غیر روایتی جوش وخروش سے منائی گئی لیکن اسی سال
ان کے یومِ وفات ۲۲ ساون ۸ اگست کی بھی سرکاری
چھٹی منظور کر دی گئی۔ یہ بات ٹیگور نے خواب وخیال
میں بھی نہیں سوچی ہوگی کہ کبھی کیلنڈر میں ایک دن انکی
موت کا جشن منانے کے لئے نکال لیا جائے گا۔
''موت کا جشن'' اور وہ بھی انکے چاہنے والے ہی
منائیں گے۔ اسکی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ عید کے تعلق
سے وہاب قیصر کا ''مولانا آزاد اور عیدین''۔ ''اردو
شاعری میں عید کا ذکر'' ''عید انڈمان ونکوبار میں۔۔۔
کل اور آج'' تینوں مضامین اچھے ہیں لیکن آخر الذکر
کی حیثیت معلوماتی بھی ہے۔

عید کے موضوع پر جمیل مظہری سمیت پانچ
شاعروں کی تخلیقات ہیں۔ جمیل صاحب کی نظم
''غریبوں کی عید'' بہ اعتبار فکر وفن بہت اونچی چیز ہے۔
یادِ رفتگاں کے تحت ایسی تخلیق انشاء کی زینت بنائی جاتی
ہے تو کوئی حرج نہیں۔ اکرام فتح پوری کا یہ شعر، انکے

حسب حال ہے:

ہو گئے مفلوج یوں اکرام تم
دو رکعت پڑھنا ہے مشکل عید میں

عید پر خاص افسانوں میں ''چندن پور کا چاند'' (نعیم کوثر) ''عیدی'' (آغا گل) ''سکّے کے دو رخ'' (ف-س-اعجاز) تینوں افسانے عنوانات اور موضوعات کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ نعیم کوثر کے افسانے میں کہیں کہیں پریم چند کے اسلوب کی جھلک ہے۔

آغا گل لاہوری ہیں اور انھوں نے علاقائی بولیوں کو بھی جگہ دی ہے۔ جیسے ''بعض قدر دان کرت دے دیا کرتے تھے'' اور ترخہ چائے (بلا شکر) اسکے علاوہ انھوں نے قصبوں اور دیہاتوں کے ڈاکخانوں کے ورک کلچر کو اجاگر کرتے ہوئے دلچسپ پیرائے میں افسانے کا اختتام کیا ہے۔ ف-س-اعجاز نے اپنے افسانے میں جاری اور منسوخ سکّوں میں فرق قائم کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ رد کی ہوئی چیز کوئی قبول نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ بھکارن کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں۔ انکی اس کہانی نے واجدہ تبسم کی کہانی ''عید'' کی یاد تازہ کردی ہے جس میں اپنی نانی سے ملی ہوئی چونی کو تعویذ بنا کر وہ گلے میں لٹکائے رہتی ہیں۔

مامون ایمن کی گیارہ رباعیاں بعنوان ''سایہ'' پسند آئیں۔ موصوف نے اس صنف میں بھی اپنی پُرگوئی کا جوہر دکھایا ہے۔ شاعروں کے تمام کلام قابلِ توجہ ہیں۔ لیکن شاعرات کے کلام پر مشتمل حصے میں رخشاں ہاشمی کی غزل قافیے سے عاری ہے۔

انکی غزل کا مطلع ہے:

ڈوبتی ہوں کبھی ابھرتی ہوں
خود ہی گرتی ہوں خود سنبھلتی ہوں

ابھرتی کا قافیہ سنبھلتی نہیں ہوگا۔ ویسے فاطمہ حسن کی نظم، رومانہ رومی اور عالیہ انصاری کی غزلیں اچھی ہیں۔ عید پر شاعرات کی تخلیقات کی کمی ضرور محسوس ہوئی لیکن مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی باوزن اور معیاری ہے۔

انجم عظیم آبادی، کولکتا

OOOOOO

O رسالہ انشاء تسلسل سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔ انشاء کے شمارہ ۳-۴ میں فیروز بخت احمد صاحب کا مضمون مولانا ابوالکلام آزاد پر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ کچھ لوگ ابھی باقی ہیں جو ادب اور اپنی تہذیب کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ فیروز بخت احمد صاحب نے اپنے مضمون میں بہت سی باتوں کی نشاندہی بڑی وضاحت سے کی ہے جن میں ادبی شخصیات اور اردو کی بقا کی نسبت سے جو تجاویز دی ہیں وہ حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ کاش اربابِ اختیار کی سمجھ میں آئے کہ ادب معاشرے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ افراد کی بھی تربیت کرتا ہے۔ اردو ادب کے ساتھ پورے برِصغیر میں جو سلوک ہو رہا ہے وہ کسی المیے سے کم نہیں۔ بہر کیف فیروز بخت احمد صاحب اپنے فکر و خیال کے لحاظ سے بے حد داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ انکی خدمت میں میرا اسلام و نیاز۔

اے-آر-انصاری-مانچسٹر-انگلستان

OOOOOO

O ایک خوبصورت ''عید مبارک'' زیرِ ٹائٹل جیج ستمبر اکتوبر کا انشاء اپنی خوبصورتی خود ہے۔ ''گفتنی'' انشاء کی ایک مایہ ناز تخلیق ہوتی ہے جس میں گپ شپ نہیں ہوتی بلکہ مُلک کی بہبودی کے لئے کارآمد صلاح ہوتی ہے۔ بنگال اپنے تہواروں اور اپنی عظیم شخصیات اور اُنکی ''پرستش بے حساب'' کے لئے سارے ملک میں مشہور ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو موجودہ بنگال سرکار نے ایک مہاپرش کا درجہ دے کر بالمیکی گرو زودی داس و گرو نانک کی صف میں پہنچا دیا ہے۔ انکے یوم ولادت اور یوم وصال پر تعطیل کا اعلان کر دیا ہے۔ اپنے فنکاروں کی عزت کرنا بجا ہے مگر بے حساب ''پرستش'' بے حساب ہے۔ ممتا بنرجی کی سرکار نے اُن کی ولادت اور یومِ وصال دونوں پر تعطیل کا اعلان کر کے ان کو خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا بلکہ انکے پیغام کی خلاف ورزی کی ہے۔ ٹیگور ہمیشہ کام اور مشقت پر زور دیتے تھے۔ اس طرح تو یو پی کے اردو دان مرزا غالب کے یومِ ولادت اور وصال پر چھٹی کی مانگ کریں گے۔ ہندی والے گوسوامی تُلسی داس کے جنم دن پر چھٹی کے خواہش مند ہونگے۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سب صفات خدا کی ہیں اور وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔ سارے علم و فن اسی سے ہیں۔ ساری تعریفیں اسی کی ہیں۔ اگر ٹیگور اور دوسروں کے ہُنر و فن خدا سے منسوب ہیں تو ایک انسان کی پرستش بے حساب کیوں ہو؟

آپ نے اپنے اداریہ میں فلم اداکار اشوک کمار کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ایم ایل شرما تاز-چنڈی گڑھ

OOOOOO

O ''عید نمبر'' میں بیشتر تخلیقات عید سے ہی متعلق ہیں۔ حسبِ معمول سب سے پہلے میں نے آپکے اداریہ بعنوان ''پرستش بے حساب'' کا مطالعہ کیا۔ جو معلومات سے بھرپور تھا۔ نعیم کوثر، آغا گل اور دیگر قلم کاروں کے افسانے عید سے ہی متعلق اور بلند پایہ افسانے تھے۔ مگر ان میں آپکا (ف-س-اعجاز) افسانہ ''سکّے کے دو رُخ'' اپنے لب و لہجے، اندازِ بیان اور مقصدیت کے اعتبار سے سبھی افسانوں پر سبقت لے گیا۔ ان خوبیوں کی بنا پر ترتیب میں اس کا پہلا مقام ہونا چاہئے تھا، مگر شاید آپ نے انکساری سے کام لیتے ہوئے اسے تیسرے درجہ میں رکھا۔ آپکا یہ سادہ طرزِ عمل آپکو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ حصہ مضامین میں: حضرت مولانا محمد علی لاہوری، پروفیسر وہاب قیصر، اور سیّد فرد الحسن کے مضامین انتہائی معلوماتی ہیں۔ حصہ منظومات میں: جمیل مظہری، مامون ایمن، ظفر کچھی اور رخشاں ہاشمی کی شعری تخلیقات نے بے حد متاثر کیا۔ حصہ مکتوبات میں رام پرکاش کپور اور سُہانہ قریشی کے خطوط بہت پسند آئے۔ دیگر تخلیقات بھی متاثر کن رہیں۔

الیس شمس الحسن گیاوی (گیا)

OOOOOO

O انشاء کا تازہ شمارہ (نومبر دسمبر) جستہ جستہ دیکھ کر سرہانے رکھ لیتا ہوں اور فراغت سے، سونے سے پہلے، پڑھتا ہوں۔ اس مرتبہ مطالعہ مکمل کرنے سے قبل ہی آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا! آپ نے حسبِ سابق ادب کا چسکا رکھنے والوں کے لئے اس ایک شمارے میں ڈھیر سارا مواد جمع کر دیا ہے۔ یہ سب اعلیٰ معیار کا ہے۔ میں خاص طور پر ملیالم کہانی ''قصہ لمبی ناک کا'' ذکر کروں گا۔ یہ بڑی اچھوتی، بڑی دلکش، نہایت دلچسپ اور زندہ کہانی ہے۔ ثابت ہوتا ہے سادگی میں کسی استعارے، ابہام یا فنی گلکاری کے بغیر بھی کتنا حسن ہوتا ہے۔ لکھنے والے اور اردو مترجم کے ساتھ آپ کو اس کی پیشکش پر دلی مبارکباد۔

اسی شمارے میں کے ایل نارنگ ساقی کا انٹرویو نثار احمد صدیقی نے بڑی دیدہ ریزی اور گہرائی میں اترتے ہوئے قلمبند کیا ہے۔ نارنگ اس کے مستحق تھے جوان سے اور ان کی مزاح نگاری سے ناواقف ہے وہ بھی جان جائے کہ اردو میں عمدہ و اعلیٰ شگفتہ نگاری نایاب و کمیاب نہیں۔ نارنگ نے جس زاویے اور جس نوع کے شگوفے جمع کر دیئے ہیں وہ اتنی سکت رکھتے ہیں

کہ وقت کی گردسے محفوظ رہیں گے۔ مبارکباد۔

مقصود الٰہی شیخ۔ بریڈفورڈ (برطانیہ)

OOOOOO

O انشاء پابندی سے مل رہا ہے۔ عید نمبر میں شامل ایم احمد مجتبیٰ کا مضمون ''عید انڈیمان ونکوبار میں۔۔۔کل اور آج'' ان جزائر اور وہاں بسے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ سید فرد الحسن کا مضمون ''اردو شاعری میں عید کا ذکر'' محنت سے لکھا گیا ہے۔ عید کی مناسبت سے دیگر مضامینِ نظم ونثر بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔

نومبر/ دسمبر میں شامل اردو طنز و مزاح کے حوالے سے نارنگ ساقی کا انٹرویو دلچسپی سے پڑھا۔ نارنگ ساقی نے طنز ومزاح کے حوالے سے کئی مفید مطلب باتیں بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر انور ادیب نے اپنے مضمون میں البیرونی اور اس کی شہرہ آفاق کتاب ''کتاب الہند'' کا بہترین تعارف پیش کیا ہے۔ ظہیر انور کی کتاب ''منظر پس منظر'' پر آپ کے تحریر کردہ مضمون سے کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فہیم جاوید کی دو غزلیں شاملِ اشاعت ہیں۔ پہلی غزل بحرِ خفیف (ارکان: فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں ہے لیکن مقطعے کا مصرعہ اولیٰ بحرِ رمل (ارکان: فاعلاتن فعلاتن فعلن) میں نظم ہوگیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

اشک بھی رکتے نہیں ہیں جاوید
ان دنوں میر ہوگیا ہوں میں

ان کی دوسری غزل کا شعر ہے:

پڑھتا ہے قرآن لحن سے
اور فقط ابجد ہے دل میں

اگر ہم لفظ ''لحن'' کو اس کے صحیح تلفظ بہ سکون دم بروزن ''فکر'' پڑھیں تو مصرع ساقط الوزن قرار پاتا ہے۔ حنیف ساحل کی غزل کا مطلع ہے:

وہ جو دکھلائے برابر دیکھنا
پل بہ پل منظر بہ منظر دیکھنا

''پل بہ پل'' کا استعمال ساحل صاحب کے شعورِ زبان پر سوالیہ نشان لگاتا ہے۔ سید نفیس دسنوی کی غزل بہت اچھی ہے۔ اگرچہ اجتماعِ ردیفین کا عیب کوئی بڑا عیب نہیں ہے تاہم اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ نفیس دسنوی کی درج ذیل شعر:

ہمارے اشک کا دریا ہمیشہ خشک رہتا ہے
مگر بہنے پہ آجائے تو پھر پیہم نکلتا ہے

کا مصرعہ اولیٰ اگر ایسا ہوتا: ہمیشہ خشک رہتا ہے ہمارے اشک کا دریا۔ تو اجتماعِ ردیفین کے عیب سے مصرع پاک ہو جاتا۔ عرفان پرھنوی ریاستِ مہاراشٹرا کے بزرگ شاعر ہیں۔ ان کی غزل کے شعر:

ہم کو اے جہاں والو نہ سنگ ریزہ سمجھنا
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

کا مصرعہ اولیٰ ساقط الوزن ہوگیا ہے۔ ان دو چار فنی اغلاط سے قطع نظر بیشتر شعری تخلیقات معیاری ہیں۔ صلاح الدین نیر، ممتاز عزیز نازاں، ساحر کلیم، نذیر فتح پوری، عرش صہبائی، ڈاکٹر نریش، اور اثر غوری کی شعری تخلیقات خاص طور سے پسند آئیں۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول
ضلع لاتور (مہاراشٹر)

OOOOOO

O آپ نے نیاز فتح پوری کی زندگی اور ادبی کاوشوں پر جس دیدہ ریزی اور محنت سے کامیاب کاوش کا ثبوت دیا ہے اس پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شمارہ نومبر دسمبر مل گیا تھا۔ پڑھا۔ نثر اور نظم متوازن ہیں۔ اس بار مضامین کسی قدر ہلکے لگے اور افسانے زیادہ موثر۔ افسانہ ''احسان کا بوجھ'' آجکل لوگوں کی مطلب پرستی اور احسان فراموشی کی زندہ مثال ہے جو ہماری زندگی میں آئے دن نظر آتی ہے۔ جبکہ ''شہنائی'' سماجی زندگی سے جڑی ہوئی آپسی محبت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور فرض شناسی کی زندہ مثال پیش کرتی ہے جو حالاتِ حاضرہ میں ناپید ہوگئی ہے۔ ''مت پوچھئے'' دلچسپ کہانی ہے۔ آجکل مردوں کی زیادہ تعداد اس المیہ کا شکار ہے۔ ''زندگی ایک سمندر'' اور ''خدا کی دُنیا بہت وسیع ہے'' بھی اچھی کہانیاں ہیں۔

شعری حصے میں برتولت بریشت کی نظموں کا ترجمہ سید محمد مہدی نے بڑی جانفشانی سے کیا ہے اور بہت اچھا ہے۔ تراجم سے دیگر زبانوں کے ادبی رجحانات سے آگاہی ہوتی ہے یہ سلسلہ جاری رکھیں تو اچھا ہوگا۔ غزلیات میں صلاح الدین نیر کا دوسرا شعر آج کی زرد صحافت yellow journalism کو پیش کرتا ہے۔ ساحر کلیم کا پانچواں شعر دورِ حاضر کی سماجی، تہذیبی بدحالی اور کرداری تنزل کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر علی عباس امید کی ہائیکو طرز پر نظم اچھی لگی معیاری تخلیق ہے۔ ڈاکٹر نریش کا مطلع خوبصورت ہے دل کو چھونے والا ہے۔ اثر غوری کا چوتھا شعر معنویت سے بھرپور ہے۔

ابرار نعمی۔ رائسین (ایم۔پی)

OOOOOO

O میری غزل کے چوتھے شعر کا مصرع ثانی غلط چھپ گیا ہے ''لو تمہیں روٹھ کے جانے کی ضرورت کیا ہے'' جب کہ اسے یوں ہونا چاہیے تھا'' تو اسے روٹھ کے جانے کی ضرورت کیا ہے۔'' تصحیح شائع فرمادیں۔

گفتنی میں جگجیت سنگھ کو ایماندار نہ خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ایک طرح سے اردو والوں کی طرف سے فرض کفایہ بھی ادا کردیا ہے۔

نثار احمد صدیقی کا '' نارنگ ساقی سے ایک مکالمہ'' خوب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انٹرویو دیگر قارئین کو بھی پسند آیا ہوگا۔ شعری حصے میں ڈاکٹر ظہیر رحمتی اور سلیم انصاری کی غزلوں نے متاثر کیا۔ زنفر کھوکھر کا انشائیہ طنز و مزاح سے آراستہ اور بصیرت سے بھرپور ہے۔

خالد عبادی، پٹنہ

OOOOOO

O نومبر دسمبر کے شمارے میں یوں تو سبھی مشمولات معیاری ہیں۔ افسانے، شاعری، ساقی سے انٹرویو بہت عمدہ ہیں۔ مضامین میں البیرونی پر انور ادیب کا مضمون اور صوبہ بہار کے بارے میں اشتیاق حسین کا مضمون بہت مفید ہیں۔ ظہیر انور پر آپ کا مضمون مجھے بہت متوازن اور کارآمد لگا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت اہم ہے۔ دوحہ، قطر کا رپورتاژ بڑی منفرد پیشکش ہے۔ میں اس کے لئے آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

عظیم الدین، بنگلور

OOOOOO

VOL : 27
Regd. No. D 74 / 09
R. N. I. Regd. No. 44083 / 86

MAHNAMA INSHA
JAN - FEB 2012

ISSUE : 1 - 2
ISSN : 0971 - 6009

PRINTED AT EJAZ PRINTING HOUSE 25-B, ZAKARIA STREET, KOLKATA - 700073
PRINTED & PUBLISHED BY F. S. EJAZ FROM 25-B, ZAKARIA STREET, KOLKATA - 700073 ● EDITOR : F. S. EJAZ